أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا
معیشت وتجارت کے
اسلامی احکام
www.KitaboSunnat.com
حافظ ذوالفقار علی
WOB R 32

معیشت وتجارت کے
اسلامی احکام

نام کتاب: ------------- معیشت وتجارت کے اسلامی احکام

مؤلف: ------------- حافظ ذوالفقار علی

ایڈیشن: ------------- اول اپریل 2010ء

قیمت: -------------

ناشر

ابوہریرہ اکیڈمی

37 کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور
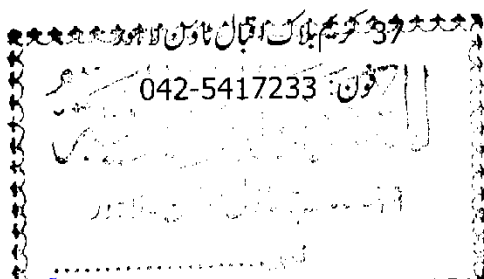
فون: 042-5417233

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا
معیشت وتجارت کے
اسلامی احکام
حافظ ذوالفقار علی صاحب
شیخ الحدیث شریعہ کالج لاہور
ناشر
ابو ہریرہ اکیڈمی
37 کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور فون: 042-5417233

فہرست مضامین

معیشت وتجارت کا اسلامی تصور

خرید وفروخت کے زریں اسلامی اصول

فروخت کی جانے والی چیز کے متعلق ہدایات

قیمت کے متعلق ہدایات

بیع میں خیار (Option) کی صورتیں

اختیارات (Options) کی بیع

بیعانہ کی شرعی حیثیت

کمیشن ایجنٹ کے ذریعے خرید وفروخت

اجارہ کے اصول اور اسلامی وروائتی بینک

صُکوک (Sukuk) کی شرعی حیثیت

اسلام کا نظریہ زر اور کاغذی کرنسی کی حقیقت

تقریظ

اسلام کوادیان عالم میں یہ خصوصی مقام حاصل ہے کہ یہ الہامی ادیان میں آخری، کامل اور جامع دین ہے۔اس میں دنیاوی اور روحانی اعمال کی تفریق کوختم کر کے معیشت اوراکل حلال کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ اسلام کا نظام معیشت نہایت مضبوط بنیادوں پر استوار ہے یہی وجہ ہے کہ آج جبکہ سامراجی اور سرمایہ داری نظام لڑکھڑا کر تباہی کے کنارے تک پہنچ چکا ہےاور خصوصا بینکاری عالمی طور پر کنگالی کا شکار ہورہی ہے،اسلام کے معاشی اصولوں کے تصور پر قائم ادارے نہ صرف مستحکم ہیں بلکہ ان کی مانگ میں گزشتہ بیس سالوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔اگر چہ ان اداروں کے بہت سے امور ایسے ہیں جن میں شرعی اصولوں سے فی الواقع مطابقت کے لئے اصلاح کی ضرورت ہےمگر پھر بھی ان کے اثاثے دیگراداروں کے مقابلہ میں نہ صرف اضافہ پذیر ہیں بلکہ محفوظ ترین شمار کئے جاتے ہیں۔

اس عملی تجربہ کے نتیجہ میں یورپ اورامریکہ میں غیر مسلم بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہورہے ہیں کہ اسلامی معاشی ادارے خواہ وہ بینک ہوں،تکافل کے دارے ہوں یا صارف کمپنیاں،رواجی معاشی اداروں سے زیادہ مستحکم اورمنافع بخش ہیں۔

لیکن اہل اسلام کوابھی تک اپنی گدڑی میں پڑے ہوئے لعل وجواہر کا نہ علم ہےاورطلب و خواہش۔قرآن کریم ہر مسلمان گھرمیں ایک سے زائد نسخوں کی شکل میں پایا جاتا ہےلیکن کتنے ذہن وقلب ہیں جواس کی معاشی تعلیمات سے آگاہ ہوں اور کتنے نفوس ہیں جوان تعلیمات کوآج کے دور میں نافذ العمل کرنے کیلئے آمادہ ہوں،کچھ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا،مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔

آج کی معاشی دنیا میں نہ صرف غیر مسلموں بلکہ خود مسلمانوں کو ان کے بیش بہا علمی ورثہ سے آگاہ کرنا اور ان کے دل ودماغ کو آج کی معاشی دوڑ کے ماحول میں اسلامی نظام معیشت کے قابل عمل ہونے پر قائل کرنا ایک اہم دینی فریضہ ہے۔

حافظ ذوالفقار علی صاحب کی تازہ تصنیف ''معیشت وتجارت کے اسلامی احکام'' اس سلسلہ میں ایک اہم کاوش ہے۔ اختصار اور سادگی کے ساتھ بہت سے موضوعات جن پر عام حالات میں صرف ماہرین ہی بحث کرتے ہیں اس کتاب میں آسان زبان میں ایک عام قاری کیلئے بیان کر دیئے گئے ہیں جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی اس گرانقدر خدمت کو قبول فرمائے اور اپنے دین کے قیام کے لئے اس کوشش میں خاص برکت پیدا فرمائے۔

یہ کتاب ان طلاب علم کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوگی جو مدارس دینیہ سے حصول علم کے بعد جدید معاشی اداروں میں کام کرنے کے خواہش مند ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد
وائس چانسلر
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے جس دین کی تکمیل فرمائی ہے وہ ایک ابدی اور جامع نظام حیات ہے جو دوسرے مذاہب کی طرح چند اخلاقی تعلیمات اور عبادات تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے تمام معاشی ،معاشرتی اور سیاسی مسائل کے متعلق مفصل ہدایات دیتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب تک کسی معاشرہ کے معاشی اور مالی معاملات مناسب اصول وضوابط کے پابند نہ ہوں تب تک اس معاشرہ کی منصفانہ تشکیل ممکن نہیں۔ اسلام چونکہ منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کا داعی ہے اس لیے قرآن وحدیث نے جہاں عبادات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل ضروری قرار دی ہے وہاں اپنی کاروباری سرگرمیوں کو بھی اللہ کے احکام کے تابع رکھنے کی تلقین کی ہے اور اس حوالے سے نہایت عمدہ اور جامع اصول عطاء کئے ہیں جن کی روشنی میں ہم اپنی معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کر سکتے ہیں مگر قابل افسوس بات یہ ہے کہ عصر حاضر میں مجموعی حیثیت سے امت مسلمہ اسلام کی معاشی وتجارتی تعلیمات سے بے خبر اور غافل ہے جس کی وجہ سے ہم معاشی میدان میں نہ صرف دین حق کی فیوض وبرکات سے محروم ہیں بلکہ نوع بہ نوع مسائل میں گرفتار ہو چکے ہیں۔

بلاشبہ مال ودولت اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور اس کی قابل قدر نعمت ہے لیکن ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارے دین نے اس مقصد کے لئے غلط اور ناروا طریقے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ ہر شخص کو حلال وجائز ذرائع استعمال کرنے کا مکلّف ٹھرایا ہے اور یہ فکر دی ہے کہ روز قیامت ہر شخص کو یہ حساب دینا ہوگا کہ اس نے مال کن ذرائع سے حاصل

کیا تھا، حلال و جائز طریقے سے یا ناجائز اور حرام طریقے سے۔ چنانچہ ہادیٔ برحق ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

'لَا تَزُولُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى يُسْأَلَ عَنْ عُمْرِهِ فِيمَا أَفْنَاهُ وَعَنْ عِلْمِهِ فِيمَا فَعَلَ وَعَنْ مَالِهِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَا أَنْفَقَهُ وَعَنْ جِسْمِهِ فِيمَا أَبْلَاهُ'

''قیامت کے دن انسان کے قدم اٹھ نہیں سکیں گے یہاں تک اس سے یہ نہ پوچھ لیا جائے کہ اس نے اپنی عمر کن کاموں میں لگائی، اور علم کے مطابق کتنا عمل کیا، اور مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا، اور اپنے جسم کی توانیاں کہاں کھپائیں۔''[1]

کسب حرام شریعت کی نگاہ میں ایک ایسا گناہ ہے جس میں مبتلا شخص کی عبادت اور دعاء بھی بے اثر رہتی ہیں جیسا کہ اس حدیث مبارک سے عیاں ہے:

'ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ'

''پھر آپ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرتا ہے پراگندہ اور غبار آلود بال اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اے رب، اے رب کہتا ہے جبکہ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام اور حرام سے ہی غذا دیا گیا پھر اس کی دعائیں کیسے قبول ہوں۔''[2]

چونکہ حرام ذرائع سے حاصل مال کے باعث انسان کی ساری محنت وریاضت رائیگاں چلی جاتی ہے اس لئے سرور کائنات ﷺ نے ایسے شخص کو سب سے بڑا عبادت گذار قرار دیا ہے

---

① سنن الترمذی باب فی القیامة.

② صحیح مسلم باب قبول الصدقة من الکسب .

جو کسب حرام سے اپنا دامن محفوظ رکھے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد عالی ہے:

'اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ '

''حرام کردہ امور سے پرہیز کرو سب لوگوں سے بڑے عبادت گذار بن جاؤ گے۔''①

اور حرام وسائل معاش سے پرہیز گاری ہی اصل زہد وتقوی ہے جیسا کہ حضرت عطیہ سے منقول ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

'لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهِ حَذَرًا لِمَا بِهِ الْبَأْسُ '

''بندہ اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک حرج والی چیزوں کے خوف سے وہ چیزیں بھی نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہ ہو۔''②

یہی وجہ ہے کہ جب حدیث کے عالی مرتبت امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ سے زہد کی حقیقت پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا:

''زہد یہ ہے کہ جب حلال میسر آئے تو شکر میں کوتاہی نہ کرے اور حرام میں واقع ہونے سے پرہیز کرے۔''③

اسی طرح ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ سے یہ سوال ہوا کہ آپ زہد کے متعلق کوئی کتاب کیوں نہیں لکھتے تو انہوں نے جواب دیا:

' قَدْ صَنَّفْتُ كِتَابَ الْبُيُوعِ وَمُرَادُهُ بَيَّنْتُ فِيهِ مَا يَحِلُّ وَيَحْرُمُ وَلَيْسَ الزُّهْدُ إِلَّا الِاجْتِنَابُ عَنِ الْحَرَامِ وَالرَّغْبَةُ فِي الْحَلَالِ '

''میں نے کتاب البیوع لکھ دی ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ میں نے اس میں

---

① سنن الترمذی باب مَنِ اتَّقَى الْمَحَارِمَ فَهُوَ أَعْبَدُ النَّاسِ .

② سنن ترمذی باب لا يبلغ العبد أن .

③ موسوعة نضرة النعيم ج 6 ص2232 بحواله المنهاج فی شعب الایمان للحلیمی .

حلال وحرام کی وضاحت کر دی ہے اور زہد حرام سے بچنے اور حلال میں رغبت رکھنے کا نام ہی تو ہے۔''[1]

یعنی زہد صرف شب وروز مصروفِ عبادت رہنے کا نام نہیں بلکہ حقیقی زہد یہ ہے کہ انسان اپنے اندر دین کی روح پیدا کر لے اور دین کے رنگ میں رنگ جائے۔ اس کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ خرید وفروخت اور لین دین کے معاملات میں حلال وحرام کا فرق ملحوظ رکھا جائے اور شریعت کے احکام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے جو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان خرید وفروخت کے بارے میں شریعت کے احکام سے کما حقہ واقف ہو۔

اس کتاب کا مقصد بھی یہ ہے کہ عوام الناس اور کاروباری طبقہ کو دین قیّم کی درخشاں اور پاکیزہ معاشی وتجارتی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے تا کہ وہ اپنے خرید وفروخت کے معاملات ان کے مطابق انجام دے سکیں۔ راقم نے اس کتاب کو حتی الامکان جامع، واضح اور قابل فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے قارئین کرام اسے مفید پائیں گے اور یہ معیشت وتجارت سے متعلق اسلامی احکام سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی اس حقیر کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازے اور ہم سب کو اپنے تجارتی اور کاروباری معاملات دینی احکام کی روشنی میں انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

طالب دعا

حافظ ذوالفقار علی

ابوہریرہ شریعہ کالج کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

[1] المبسوط للسرخسي انواع الربا.

معیشت وتجارت کا اسلامی تصور

اسلام اور دیگر نظام ہائے معیشت میں فرق

معیشت وتجارت کے حوالہ سے دین اسلام کا طُرَّہ امتیاز یہ ہے کہ یہ نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح لوگوں کو کھلی چھٹی دیتا ہے کہ ہر شخص اپنے کاروبار کو ترقی دینے اور نفع آفرینی کیلئے جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔ چاہے سودی کاروبار کرے، شراب بیچے، جوا کھیلے، عصمت فروشی کرے یا ذخیرہ اندوزی اس پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ اور نہ ہی کمیونزم اور سوشلزم کی طرح آہنی زنجیروں میں جکڑتا ہے کہ تمام وسائل پیداوار حکومت کے قبضہ میں ہوں اور وہ افراد کو نظر انداز کر کے ساری منصوبہ بندی خود ہی کرے۔ افراد کو نہ تو انفرادی طور پر ان پر مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ حسب منشاء ان سے تنہا فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ اسلام کا رویہ اعتدال پر مبنی ہے کہ جہاں شخصی ملکیت کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا نفع اندوزی کے جذبہ کو تسلیم کرتا اور اپنے ماننے والوں کو تجارت کے ذریعے کسب مال کی ترغیب دیتا ہے وہاں دولت کمانے کا عام لائسنس نہیں دیتا بلکہ حلال وحرام کا امتیاز قائم کرتا اور کاروبار کے لئے رہنما اصول پیش کرتا ہے جن کو ملحوظ رکھنا اشد ضروری ہے۔ ان اصولوں کی پابندی کر کے جو بھی کاروبار یا لین دین کیا جائے وہ شریعت کی نگاہ میں جائز تصور ہوتا ہے خواہ وہ دور جدید کی ہی پیداوار ہو، یعنی اسلام کا رویہ معتدل ہونے کے ساتھ ساتھ جامع اور لچک دار بھی ہے جو ہر دور کے تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ اپنی اسی خوبی کی بنا پر دین اسلام دیگر نظام ہائے معیشت پر فوقیت رکھتا ہے۔

اسلام کے وضع کردہ اصول چونکہ انتہائی حکیمانہ، متوازن، معاشی خوشحالی اور حقیقی ترقی کے ضامن ہیں اور ان کی خلاف ورزی ایسی معاشی برائیوں کو جنم دیتی ہیں جو آہستہ آہستہ پورے

معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں اس لئے اسلامی ریاست میں ان لوگوں کو کاروبار کی قطعاً اجازت نہیں جو خرید وفروخت اور تجارت کے متعلق اسلامی احکام سے واقف نہ ہوں۔ چنانچہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔

'لَا يَبِعْ فِي سُوقِنَا اِلَّا مَنْ تَفَقَّهَ فِي الدِّيْنِ'

"ہمارے بازاروں میں وہی خرید وفروخت کرے جسے دین (کے تجارتی احکام) کی سمجھ ہو۔"[1]

تیرھویں صدی ہجری کے مالکی فقیہ محمد بن احمد الرھونی رحمہ اللہ (متوفی 1230ھ) نے اپنے شیخ ابو محمد رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے

"کہ انہوں نے مراکش میں محتسب کو بازاروں میں گشت کرتے دیکھا جو ہر دکان کے پاس ٹھہرتا اور دکان دار سے اس کے سامان سے متعلق لازمی احکام کے بارہ میں پوچھتا اور یہ دریافت کرتا کہ ان میں سود کب شامل ہوتا ہے اور وہ اس سے کیسے محفوظ رہتا ہے۔ اگر وہ صحیح جواب دیتا تو اس کو دکان میں رہنے دیتا اور اگر اسے علم نہ ہوتا تو اسے دکان سے نکال دیتا اور کہتا تیرے لیے مسلمانوں کے بازار میں بیٹھنا ممکن نہیں تو لوگوں کو سود اور ناجائز کھلائے گا۔"[2]

بے دین حلقوں کا پراپیگنڈہ

اسلامی تعلیمات سے ناآشنا بعض حلقے یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام کے معاشی اور تجارتی احکام پر عمل کرنے سے ہماری کاروباری سرگرمیوں پر جمود طاری ہو جائے گا اور ہم معاشی اعتبار سے بہت پیچھے چلے جائیں گے، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ حقیقی اور دیرپا ترقی کے لیے

---

(1) جامع ترمذی : ابواب الوتر، باب ما جاء فی فضل الصلاۃ علی النبی .

(2) اوضح المسالك بحواله بحوث فقهية في قضايا اقتصادية معاصرة ج 1 : ص145 .

تجارتی سرگرمیوں کو مناسب اصول وضوابط کے دائرہ میں رکھنا انتہائی ضروری ہے۔اس وقت دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جس نے اپنی معیشت کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے تھوڑی بہت پابندیاں نہ لگا رکھی ہوں لیکن چونکہ ایک تو ان پابندیوں کی بنیاد وحی کی بجائے عقل انسانی پر ہے اور دوسرا سرمایہ داری نظام کا بنیادی اصول کہ ہر انسان حصول مال اور افزائش دولت کے جس جس انداز کو بہتر سمجھتا ہے آزادانہ اس کو استعمال میں لا سکتا ہے اپنی جگہ پر قائم ہے اس لئے غیر معمولی بحران میں یہ پابندیاں کارگر ثابت نہیں ہوتیں۔ حقیقت پسند معاشی تجزیہ کاروں کے مطابق حالیہ عالمی مالیاتی بحران کا بنیادی محرک ہماری معیشت کا اخلاقی قیود اور پابندیوں سے مستثنیٰ ہونا ہے، لہٰذا اس بحران سے نمٹنے کا بہترین طریقہ کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں کو قواعد وضوابط کا پابند بنانا ہے۔

اور اگر یہ ناقدین اسلام کے معاشی وتجارتی احکام کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیں تو خود گواہی دینگے کہ اسلامی طریقہ تجارت نہایت اعلی وارفع ہے جس میں شتر بے مہار آزادی، ہوس وحرص، مفاد پرستی اور خود غرضی کو کنٹرول کرنے کا شاندار میکانزم موجود ہے اور حقیقت میں یہی وہ خرابیاں ہیں جو معاشرے کے اجتماعی مفادات پر اثر انداز ہوتی اور معاشی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کا باعث بنتی ہیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں جو اکثر وبیشتر تجارت پیشہ تھے اور ان کی تمام تر کاروباری سرگرمیاں شریعت کے تابع ہی ہوتی تھیں مگر اس کے باوجود انہوں نے معاشی میدان میں بے مثال ترقی کی، ہر طرف مال ودولت کی فروانی، آسودگی اور خوشحالی عام تھی۔ وسیع تر اسلامی مملکت میں کوئی زکوۃ قبول کرنے والا نہ ملتا تھا۔معاشی اعتبار سے کمزور ترین افراد بھی زکوۃ ادا کرنے کے قابل ہوگئے تھے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ معاشی ترقی کے لیے بے قید آزادی ناگزیر نہیں بلکہ یہ مقصد حدود وقیود کے اندر رہ کر بھی بخوبی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں معیشت وتجارت کی حیثیت

اسلام جس طرح دینی، روحانی اور اخلاقی ہدایات کا معلم ہے اسی طرح معاشی خوشحالی کا بھی داعی ہے اس لیے وہ مالی فوائد، تجارتی اور معاشی سرگرمیوں کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم اور احادیثِ نبوی ﷺ میں بڑے شوق آفرین انداز میں خرید وفروخت کے ذریعے کسب مال کی ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر تجارت کے ذریعے حاصل ہونے والے فوائد کو اللہ کا فضل قرار دیا ہے۔ حج کے معاشی اور تجارتی پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ﴾

''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم (تجارت کے ذریعے) اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔ پھر جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعر حرام (مزدلفہ میں ایک پہاڑی) کے پاس اللہ کو یاد کرو۔ اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے بلاشبہ اس سے پہلے تم ناواقف تھے۔''[1]

حج کے دنوں میں جب سارے عرب سے لوگ مکہ مکرمہ میں حاضر ہوتے تو بازار مال تجارت سے بھر جاتے اور خرید وفروخت کا تانتا بندھا رہتا جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے۔ بعض مسلمان احتیاط کے پیش نظر دوران حج تجارت سے اجتناب کرتے تھے۔ اللہ تعالی نے ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ رب کے فضل سے مراد یہاں تجارت اور کاروبار ہے یعنی دوران حج مالی، تجارتی اور معاشی فوائد حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ کا فضل تلاش کرنے کے مترادف ہے بشرطیکہ حج کے مناسک متاثر نہ ہوں۔

---

① البقرة 198.

قوموں کی معاشی خوشحالی کا تمام تر دارومدار تجارت ہی پر ہوتا ہے اور کسی قوم کی اقتصادی ترقی میں اس کا وہی کردار ہوتا ہے جو انسانی جسم میں خون کا ہے اس لئے قرآن حکیم میں نماز جمعہ کے بعد فارغ بیٹھنے کی بجائے تجارت کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

''پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرو تا کہ تم فلاح پاجاؤ۔''[1]

یہاں بھی اللہ کا فضل تلاش کرو سے مراد کسب مال ہے جس میں خرید وفروخت بھی شامل ہے گویا تجارت محض دنیاوی کام نہیں جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ اللہ کا فضل تلاش کرنے کے مترادف ہے۔اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر کاروبار میں اسلامی احکام کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ کاروبار بھی اللہ کے قرب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔اس کے علاوہ قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر بھی تجارت اور مال کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سید الانبیاء ﷺ نے بعثت سے قبل خود بھی تجارت کی اور صحابہ کو بھی اس کی ترغیب دیتے چنانچہ اکثر وبیشتر صحابہ کرام تجارت ہی کرتے تھے۔احادیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تجارت کو بہت معزز پیشہ قرار دیا گیا اور دیانت دار تاجر کا بڑا مرتبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ایک حدیث میں سرور کائنات ﷺ نے سچے اور دیانتدار تاجر کو جنت میں انبیاء،صدیقین اور شہداء کی رفاقت کی بشارت سنائی ہے۔

'التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ'

''راست باز اور امانت دار تاجر انبیاء،صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''[2]

---

[1] الجمعة 10.

[2] سنن ترمذی باب ما جاء فی التجار و قال هذاحدیث حسن.

ایک مرتبہ حضور نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کسب معاش کا بہترین اور باعث برکت ذریعہ کونسا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

'عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ'

''انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور ہر بیع مبرور۔''[1]

یعنی بہترین پیشہ وہ ہے جس میں انسان کو اپنے ہاتھ سے محنت کرنی پڑے یا پھر ایسی تجارت جس میں امانت ودیانت کی روح کارفرما ہو۔ ثابت ہوا تجارت بابرکت ذریعہ معاش ہے تاہم اس میں دنیا ہی مدنظر نہیں ہونی چاہیے بلکہ آخرت کی فلاح بھی مطلوب ہے اس لیے یہ شریعت کے تابع ہونی چاہیے۔ جو خرید وفروخت شریعت کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر کی جائے اس کو بیع مبرور کہتے ہیں۔ یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ہماری معاشی سرگرمیوں کو ایک نظم ونسق کے تحت دیکھنا چاہتا ہے۔

خرید وفروخت کی اجازت کا فلسفہ

یہ بات مسلّم ہے کہ خرید وفروخت ہمیشہ سے انسانی زندگی کا لازمی حصہ رہا ہے اس لیے کہ یہ انسان کی فطری ضرورت ہے جس کے بغیر اس کی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں کیونکہ دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی لحاظ سے دوسروں کا دست نگر ہے، یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے استعمال کی تمام اشیاء خود ہی پیدا یا تیار کرلے۔ مثلاً ایک شخص کسان ہے جو اپنی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود ہی کھیتی باڑی کرتا ہے مگر زرعی آلات، لباس اور رہائش کے سلسلے میں وہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے ''الانسان مدنی بالطبع'' انسان اپنی حاجات وضروریات کے لیے ہر آن دوسروں کا محتاج ہے۔ جب ہر شخص کی ضرورتیں دوسروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں تو پھر خرید وفروخت کے معاملات ناگزیر ہیں۔

---

[1] مسند احمد 17728.

اگر خرید وفروخت کا سلسلہ نہ ہوتا تو نظام حیات درہم برہم ہو جاتا، انسانیت اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتی، انسان ضروریات زندگی کے حصول کے لیے یا تو چوری اور لوٹ مار کا سہارا لیتا جس سے نہ صرف لوگوں کے اموال خطرات میں پڑ جاتے بلکہ خونریزی کا بازار بھی گرم ہوتا یا دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہوتا جو کہ باعث ذلت ہے اور بسا اوقات مالک معاوضہ کے بغیر دینے پر آمادہ بھی نہیں ہوتا، لہذا اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر یہ خاص لطف وکرم فرمایا کہ انہیں اپنی ضرورتیں پوری کرنے کیلیے نہ صرف خرید وفروخت کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اس کے متعلق احکام وہدایات دے کر ثواب اور اپنے قرب کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

بیع کا تعارف

اس سے پیشتر کہ ہم خرید وفروخت کے متعلق اسلامی احکام ذکر کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیع کی حقیقت واضح کر دی جائے کیونکہ کتب حدیث میں لین دینکے معاملات اور ان سے متعلقہ احکام بالعموم کتاب البیوع کے تحت ذکر ہوتے ہیں۔قرآن حکیم نے بھی ان معاملات کے لیے یہی اصطلاح استعمال کی ہے اور ہمارے معاشرے میں بھی خرید وفروخت کے معاہدے بیع نامہ کے عنوان سے ہی تحریر ہوتے ہیں۔

بیع کا معروف معنی ہے''بیچنا'' لیکن یہ خریدنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں اشیاء کا لین دین اشیاء کے بدلے ہی ہوتا تھا یعنی بارٹر سسٹم رائج تھا اس طریقہ میں ہر شخص گویا فروخت کنندہ بھی ہوتا تھا اور خریدار بھی ،اس سے بیع کے لفظ میں دونوں معنی پیدا ہو گئے۔

علمائے شریعت کے نزدیک لین دین کے وہ تمام معاملات جو کسی معاوضہ کی اساس پر طے پاتے ہیں بیع کہلاتے ہیں اس لیےبیع کا شرعی مفہوم یوں بیان کیا جاتا ہے۔

'والبیع نقل ملك الی الغیر بثمن'

"بیع کا معنی ہے قیمت کے عوض چیز کی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل کرنا۔"[1]

یہ تعریف اس امر کا ثبوت ہے کہ اگرچہ قرض میں بھی انتقال ملکیت ہوتا ہے تاہم اس کو بیع نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قرض کا مقصد قرض لینے والے کے ساتھ نیکی کرنا ہے نہ کہ قیمت وصول پانا۔ واضح رہے بیع میں ملکیت کی منتقلی دائمی ہونی چاہیے۔

بیع اور سود میں فرق

بعض سودی ذہن کے حامل لوگ بیع اور قرض کو گڈمڈ کر دیتے ہیں حالانکہ دونوں میں اصولی فرق ہے جو درج ذیل ہے۔

1. بیع میں فروخت کنندہ کسی ایسی شئے پر نفع لیتا ہے جو اس نے اپنا سرمایہ اور محنت خطرے میں ڈال کر حاصل یا پیدا کی ہوتی ہے جبکہ اس کے برخلاف سود میں سود خور صرف اپنا پیسہ جو محض ذریعہ تبادلہ ہے قرض دے کر بغیر کسی محنت، مشقت اور نقصان کی ذمہ داری کے اس پر طے شدہ منافع لیتا ہے۔
2. بیع میں بیچی گئی چیز کی سپردگی اور قیمت کی ادائیگی کے بعد فریقین کے درمیان معاملہ ختم ہو جاتا ہے، ان کے مابین کوئی لین دین باقی نہیں رہتا جبکہ سود میں قرض لی گئی رقم کی واپسی لازمی ہوتی ہے۔
3. بیع میں خریدار کا فائدہ یقینی اور متعین ہوتا ہے کہ اس نے خریدی گئی چیز سے کسی نہ کسی صورت میں فائدہ اٹھانا ہے لیکن قرض پر سود دینے والے کا فائدہ غیر یقینی اور غیر متعین ہوتا ہے۔ اگر قرض کی رقم کاروبار میں لگائی ہو تو نقصان کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ بیع بائع اور مشتری دونوں کے فائدہ پر مبنی ہے جبکہ سود میں صرف قرض دینے والے کا فائدہ ہوتا ہے۔
4. خرید وفروخت میں صرف ایک ہی مرتبہ منافع لیا جاتا ہے لیکن سود میں جب تک قرض کی رقم

---

[1] فتح الباری: ج4، ص364.

واپس نہ کردی جائے منافع کی وصولی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

بیع اور تجارت کا باہمی فرق

بیع کے مقابلہ میں تجارت کا مفہوم قدرے محدود ہے تجارت کا مطلب ہے Trade یعنی کوئی چیز اس غرض سے خریدنا تا کہ اسے بیچ کر نفع حاصل کیا جائے خواہ بعد میں نفع ہو یا نقصان، جبکہ بیع کا لفظ وسیع تر معنی میں استعمال ہوتا ہے۔خرید وفروخت کی دو قسمیں ایسی ہیں جو بیع تو ہیں مگر تجارت میں شامل نہیں۔

1. ذاتی استعمال کے لیے چیز خریدنا، یہ بیع ہے لیکن تجارت نہیں کیونکہ اس کا محرّک نفع کا حصول نہیں بلکہ اپنی ضرورت ہے۔
2. کسان کا اپنی فصل یا مینوفیکچرر کا اپنی مصنوعات بیچنا بیع تو ہے مگر تجارت نہیں کیونکہ یہ دونوں کسی سے چیز خرید کر نہیں بیچتے بلکہ خود پیدا یا تیار کرتے ہیں۔تجارت تب ہی ہوگی جب چیز ایک سے خرید کر دوسرے کو بیچی جائے۔

بیع کی اقسام

مختلف اعتبار سے بیع کی مختلف قسمیں ہیں۔جو چیز بطور قیمت دی جائے اس کے اعتبار سے بیع کی چار قسمیں ہیں۔

1. چیز کا تبادلہ چیز کے ساتھ ہو،مثلاً گندم کے بدلے چاول یا زمین دے کر مکان لینا۔اس کو باٹر سیل 'اَلْمُقَایَضَۃ' کہتے ہیں۔
2. روپے پیسے کے بدلے کوئی چیز خریدنا، یہ صورت بغیر کسی قید کے بیع مُطْلَق کہلاتی ہے کیونکہ عموماً خرید وفروخت اسی طرح ہوتی ہے۔
3. نقدی کے بدلے نقدی کا لین دین، اس کو بیع الصرف یعنی منی چینجنگ کا کاروبار کہتے ہیں۔
4. ایک طرف کسی چیز کا حق استعمال یا کسی شخص کی محنت ہو خواہ وہ محنت جسمانی ہو یا ذہنی اور

دوسری طرف اس کا معاوضہ تو اس کے لیے اِجارَہ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ جس کا معنی ہے کرایہ داری اور محنت مزدوری کا معاملہ۔ اس کے احکام علیحدہ بیان کئے جائیں گے۔

قیمت کی ادائیگی کے اعتبار سے بھی بیع کی چار قسمیں ہیں۔

خریدی گئی چیز کی حوالگی اور قیمت کی ادائیگی دونوں نقد ہوں تو اس کو نقد خرید وفروخت اور اگر چیز کی سپردگی تو فوری ہو مگر قیمت کی ادائیگی مستقبل کی کسی تاریخ پر طے ہو تو اسے ادھار خرید وفروخت 'بیع مُؤَجَّل' کا نام دیتے ہیں۔ جب قیمت کی مکمل ادائیگی تو پیشگی کر دی جائے لیکن چیز کی حوالگی کے لیے مستقبل کی کوئی تاریخ مقرر ہو تو اس کو ''بیع سَلَم'' کہتے ہیں جو کچھ مخصوص شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ اگر قیمت کی ادائیگی اور چیز کی سپردگی دونوں ادھار ہوں تو اس کو حدیث میں 'بَیْعُ الْکَالِیٔ بِالْکَالِیٔ' کہا گیا ہے جو کہ ناجائز ہے

فائدہ: بعض اوقات مشتری فوری ادائیگی کی بجائے یہ کہہ دیتا ہے کہ پیسے بعد میں دوں گا، بعد میں کب دوں گا یہ طے نہیں ہوتا۔ یہ صورت ادھار میں شامل نہیں بلکہ نقد کی ہی ایک شکل ہے جس میں فروخت کنندہ کچھ رعایت دے دیتا ہے۔ اس میں اور ادھار میں فرق ہے۔ وہ یہ کہ ادھار میں مقررہ مدت سے قبل ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا جبکہ اس صورت میں فروخت کنندہ جب چاہے تقاضا کر سکتا ہے۔ اگر چہ وہ اپنی مرضی سے جب تک چاہے تاخیر کرتا رہے لیکن اصولی طور پر اسے بیع کے فوری بعد مطالبے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

قیمت فروخت کے لحاظ سے بھی بیع کی مختلف قسمیں ہیں۔

1. مُساومہ

یہ خرید وفروخت کی ایک عام قسم ہے جس میں فروخت کنندہ اپنی قیمت خرید یا لاگت ظاہر کئے بغیر کسی بھی قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ مساومہ کا معنی ہے ''بھاؤ تاؤ''۔ اس میں چونکہ فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان قیمت کا تعین بھاؤ تاؤ کے ذریعے ہوتا ہے فروخت کنندہ اپنی لاگت بتانے کا پابند نہیں ہوتا اس لیے اسے مساومہ کہتے ہیں۔ جہاں فروخت کنندہ ان اشیاء کی لاگت کا صحیح

انداز ہ نہ لگا سکتا ہو جو وہ فروخت کرنا چاہتا ہو وہاں مساومہ ایک مثالی طریقہ ہو سکتا ہے۔

2. نیلام

فروخت کنندہ یوں کہے جو مجھے زیادہ قیمت دے گا میں یہ چیز اس کو بیچ دوں گا۔ یہ بھی اصل میں مساومہ کی ہی ایک قسم ہے جس میں فروخت کنندہ ایک متعین قیمت طلب کرنے کی بجائے خریداری کے خواہاں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ قیمت لگائیں جس کی بولی زیادہ ہو گی اس کے ساتھ بیع منعقد ہو جائے گی۔

اس کے مقابلے میں ٹینڈر (مُناقصہ) پر خریداری ہے جس میں خریدار یہ کہتا ہے کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے جو کم قیمت پر مہیا کرے گا میں اس سے لوں گا۔ یہ جدید صورت ہے جس کا قدیم فقہی ذخیرہ میں تذکرہ نہیں ملتا تاہم اس کا بھی وہی حکم ہے جو نیلام کا ہے۔

3. مُرابحہ

مرابحہ سے مراد ہے کہ فروخت کنندہ کوئی چیز اس وضاحت کے ساتھ بیچے کہ اس پر میری یہ لاگت آئی ہے اور اب میں اتنے منافع کے ساتھ فلاں قیمت پر آپ کو بیچتا ہوں۔ مرابحہ کا معنی ہے ''نفع پر بیچنا'' مرابحہ میں قیمت نقد بھی ہو سکتی ہے اور ادھار بھی۔ فروخت کندہ کی جانب سے مشتری کو اپنی لاگت اور اس میں شامل منافع سے آگاہ کرنا ہی وہ نکتہ ہے جو مرابحہ کو مساومہ سے الگ کرتا ہے۔ تجارت میں ناتجربہ کار اور بھاؤ تاؤ سے ناواقف شخص کیلئے مرابحہ سودمند طریقہ ہے۔

4. تولیہ

جب فروخت کنندہ کوئی چیز نفع ونقصان کے بغیر لاگت قیمت پر ہی فروخت کرے تو اس کو بیع تولیہ کہتے ہیں۔ تولیہ کا لغوی معنی ہے ''والی بنانا'' فروخت کنندہ چونکہ نفع حاصل کئے بغیر ہی خریدار کو چیز کا مالک بنا دیتا ہے اس لیے اس کو تولیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

5. وَضْعِیَّہ

وضعیہ کا معنی ہے قیمت خرید سے کم پر بیچنا، یعنی خسارے کا سودا۔

آخری تین قسموں میں چونکہ فروخت کنندہ اپنی قیمت خرید یا لاگت بتا کر سودا کرتا ہے اور خریدار اس پر اعتماد کرتا ہے اس لیے ان کو 'بُیُوعُ الْاَمانَۃ' امانت داری پر مبنی بیوع کا نام دیا جاتا ہے۔

خرید وفروخت کے زریں اسلامی اصول

خرید وفروخت کا جو معاملہ بھی ہو اس میں تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

1. معاملہ کرنے والے فریقین۔
2. وہ چیز جس کا سودا کیا جا رہا ہو۔
3. چیز کی قیمت۔

شریعت نے ہر ایک کے لیے الگ الگ ہدایات دی ہیں۔فریقین کے لئے جو اصول مقرر کیئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

معاملہ باہمی رضامندی سے طے پانا چاہیے

بیع کی شرط اول یہ ہے کہ فریقین کا نہ صرف ذہنی توازن درست ہو اور وہ معاملات کی سوجھ بوجھ رکھتے ہوں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سودے پر یکساں طور پر رضامند ہوں چنانچہ لین دین کے وہ تمام معاملات جن میں فریقین کی حقیقی رضامندی یکساں طور پر نہ پائی جاتی ہو ناجائز ہیں۔چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾

"اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔اور اپنے نفسوں کو قتل نہ کرو۔بلاشبہ اللہ تمہارے ساتھ رحم کرنے والا ہے۔"[1]

---

[1] النساء 29.

سورہ نساء کی یہ آیت تجارتی اور معاشی تعلقات کے متعلق بنیادی اصول پیش کر رہی ہے کہ وہ کاروباری اور تجارتی معاملات جن پر دونوں فریق یکساں مطمئن اور راضی نہ ہوں باطل ہیں۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ لین دین میں فریقین کی باہمی رضامندی لازم ہے۔شریعت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی کسی کو اپنی چیز بیچنے پر مجبور کرے یا زبردستی اپنی پسند کی قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔اسلام نے ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت کو یکساں محترم قرار دیا ہے۔آنحضور ﷺ نے لاٹھی جیسی معمولی چیز کو بھی قابل حرمت قرار دیا ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

'لَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ أَنْ يَأْخُذَ عَصَا أَخِيهِ بِغَيْرِ طِيبَةِ نَفْسٍ مِنْهُ '

''کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کی لاٹھی (بھی) اس کی قلبی خوشی کے بغیر لے۔''[1]

خاص خرید وفروخت کے متعلق آپ ﷺ کا فرمان ہے:

'إنما البيع عن تراض '

''بیع صرف باہمی رضامندی سے ہوتی ہے۔''[2]

واضح رہے یہ رضامندی حقیقی ہونی چاہیے نہ کہ مصنوعی۔لہذا کسی دباؤ کے تحت یا غلط تاثر کی بنیاد پر یا دوسرے فریق کو چیز کی حقیقت سے بے خبر یا اصل قیمت سے دھوکے میں رکھ کر حاصل کی گئی رضامندی قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ یہ مصنوعی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے شریعت نے اس قسم کی دھوکہ دہی کی صورت میں متاثرہ فریق کو معاملہ منسوخ کرنے کا اختیار دیا ہے۔

اسی طرح ایک شخص اگر انتہائی بے بسی اور مجبوری کی بنا پر اپنی چیز بیچ رہا ہو تو ایسے شخص سے مارکیٹ ریٹ سے بہت کم پر خریدنا اگرچہ بظاہر وہ اس پر راضی بھی ہو نا جائز ہے۔معمولی کمی بیشی

---

[1] بلوغ المرام بحواله ابن حبان و الحاكم.

[2] ارواء الغليل ج 5 ص125.

کی تو گنجائش ہے لیکن بہت زیادہ فرق درست نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے قلبی خوشی کی تاکید فرمائی ہے اور یہ بات طے ہے کہ مجبور شخص خوشدلی سے غیر معمولی کم ریٹ پر بیچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں مجبور شخص سے سستے داموں خریدنے کو ترجیح دی جاتی ہے یہ ناپسندیدہ رد یہ ہے جس کی اصلاح ہونی چاہیے۔

البتہ بعض صورتوں میں حکومت یا کوئی مجاز اتھارٹی مالک کو اس بات پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنی چیز فروخت کرے۔

- پہلی صورت یہ ہے کہ مقروض اپنے ذمے قرض ادا نہ کر رہا ہو اور اس کے پاس نقد رقم بھی موجود نہ ہو تو عدالت اس کو اپنی جائیداد فروخت کر کے قرض ادا کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔ اگر وہ عدالتی حکم کے باوجود لیت ولعل سے کام لے تو عدالت قرض خواہ کی دادرسی کے لیے خود بھی اس کی جائیداد مارکیٹ ریٹ پر فروخت کر سکتی ہے۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے جائیداد رہن رکھ کر قرض لے رکھا ہو اور وہ متعدد مرتبہ کی یاددہانی کے باوجود ادائیگی نہ کر رہا ہو تو قرض خواہ رہن شدہ جائیداد فروخت کر کے اپنا حق وصول پا سکتا ہے، چاہے مقروض اس پر راضی نہ بھی ہو بشرطیکہ عدالت اور قرض خواہ منصفانہ قیمت پر بیچنے کو یقینی بنائیں، اپنی رقم کھری کرنے کے لالچ میں کوڑیوں کے بھاؤ بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔
- تیسری صورت جہاں مالک کو اپنی اشیاء فروخت کرنے پر مجبور کیا سکتا ہے وہ ہے جب غذائی اشیاء کی قلت ہو اور کچھ لوگ ذخیرہ اندوزی کر رہے ہوں تو اس صورت میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ تاجروں کو ذخیرہ کی گئی اشیاء فروخت کرنے کا حکم دے، اگر وہ تعمیل نہ کریں تو حکومت ان کی مرضی کے خلاف خود بھی مارکیٹ ریٹ پر فروخت کر سکتی ہے، جیسا کہ الموسوعة الفقهية میں ہے۔

'إذا خيف الضّرر على العامّة أجبر بل أخذ منه ما احتكره وباعه

وأعطاه المثل عند وجوده أو قيمته وهذا قدر متّفق عليه بين الأئمّة ولا يعلم خلاف في ذلك'

''جب عوام کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتو حاکم ذخیرہ اندوز کو مجبور کرے گا بلکہ اس سے ذخیرہ شدہ مال لے کر فروخت کر دے گا اور اس کو اس مال کا مثل جب موجود ہو یا اس کی قیمت دے گا۔ اتنی بات تمام آئمہ میں متفق علیہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔''[1]

✿ کسی کی چیز زبردستی لینے کی چوتھی صورت یہ ہے کہ حکومت کو عوامی مقاصد کے لیے کسی جگہ کی حقیقی ضرورت ہو اور مالکان بیچنے پر آمادہ نہ ہوں تو حکومت وہ جگہ زبردستی بھی حاصل کرسکتی ہے تاہم حکومت پر فرض ہوگا کہ مالکان کو مارکیٹ ریٹ کے حساب سے ادائیگی کرے۔ حکومت بازاری قیمت ادا کئے بغیر کسی شہری کو اس کی جائیداد سے محروم نہیں کرسکتی۔

خریدنے سے پہلے فروخت کرنا ممنوع ہے

نبی ﷺ نے یہ تلقین بھی فرمائی ہے کہ بیچنے والا فقط اسی چیز کا سودا کرے جس کا وہ کلی طور پر مالک بن چکا ہو۔ بعض دفعہ کاروباری حضرات کے پاس چیز موجود نہیں ہوتی مگر وہ اس امید پر سودا طے کر لیتے ہیں کہ بعد میں کہیں سے خرید کر فراہم کر دینگے یہ منع ہے، کیونکہ ممکن ہے مالک وہ چیز بیچنے پر آمادہ ہی نہ ہو یا وہ اس کی قیمت فروخت سے دگنی قیمت طلب کر لے اور یہ نقصان سے بچنے کے لیے خود ہی خریدنے پر تیار نہ ہو، اس طرح فریقین کے مابین تنازعات جنم لینے کا اندیشہ ہے، لہٰذا شریعت اسلامیہ نے ان کے سدّ باب کے لیے یہ اصول بنا دیا ہے کہ وہ متعین چیز جو فی الحال فروخت کنندہ کی ملکیت میں نہ ہو اس کا سودا نہ کیا جائے، جیسا کہ جناب حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

[1] الموسوعة الفقهية ج 2، ص 95.

'یَاْتِینِی الرَّجُلُ فَیَسْأَلُنِی الْبَیْعَ لَیْسَ عِنْدِی أَبِیعُهُ مِنْهُ ثُمَّ أَبْتَاعُهُ لَهُ مِنَ السُّوقِ'

''میرے پاس ایک آدمی آتا ہے وہ مجھ سے ایسی چیز کا سودا کرنا چاہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی کیا میں اس سے سودا کرلوں پھر وہ چیز بازار سے خرید کر اسے دے دوں۔''

آپ ﷺ نے جواباً فرمایا:

'لَا تَبِعْ مَا لَیْسَ عِنْدَكَ'

''جو (متعین) چیز تیرے پاس موجود نہیں وہ فروخت نہ کر۔''[1]

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کا سوال متعین چیز کی فروخت کے متعلق ہی تھا۔ متعین کا معنی ہے کسی مخصوص پلاٹ یا گاڑی وغیرہ کا سودا کرنا مثلاً یوں کہنا کہ میں فلاں سکیم کا فلاں نمبر پلاٹ آپ کو اتنے میں بیچتا ہوں جبکہ وہ اس کی ملکیت نہ ہو، یہ ناجائز ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے جواب سے واضح ہے۔ لیکن اگر تعین کی بجائے صرف مخصوص صفات بیان کی جائیں مثلاً یوں کہا جائے کہ میں تمہیں اتنی مدت بعد ان صفات کی حامل فلاں چیز مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں تو یہ صورت جائز ہے بشرطیکہ مکمل قیمت پیشگی ادا کر دی جائے، اس کو بیع سلم کہتے ہیں۔ مکمل قیمت کی پیشگی ادائیگی لازمی شرط ہے اس کے بغیر یہ جائز نہیں ہوسکتی۔

ملکیت سے قبل فروخت کی بعض صورتیں

❀ بعض ہاؤسنگ اسکیمیں اپنی ملکیتی زمین سے زیادہ تعداد میں پلاٹس کی فائلیں فروخت کر دیتی ہیں مثلاً ابھی تک اسکیم کے پاس زمین صرف ایک ہزار پلاٹس کی موجود ہے لیکن فائلیں دو ہزار پلاٹس کی بیچ دی جاتی ہیں اور ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ بقیہ زمین بعد میں خرید

[1] سنن نسائی : باب بیع مالیس عند البائع.

لی جائے گی، اس طرح اسکیم مالکان کو کچھ مدت کے لیے لوگوں کی دولت سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے اور یہی جلب منفعت ان کا مطمع نظر ہوتا ہے۔ یہ طریقہ سراسر خلاف شریعت ہے کیونکہ اسکیم نے ایک ہزار پلاٹس کی جو زائد فائلیں فروخت کی ہیں ان کی زمین ابھی اس کی ملکیت میں نہیں آئی، لہٰذا اسکیم مالکان کو ان کی فروخت کا حق بھی نہیں پہنچتا۔

❁ ہمارے ہاں جائیداد کی خرید وفروخت کے مروجہ طریقہ کار کے مطابق خریدار معاہدہ خرید کر کے کچھ رقم (بیعانہ) ادا کر دیتا ہے اور بقیہ ادائیگی کے لیے مہلت لے لیتا ہے اور معاہدے میں یہ شرائط بھی طے ہوتیں ہیں کہ اگر خریدار منحرف ہو گیا تو بیعانہ کی رقم ضبط ہو جائیگی اور اگر فروخت کنندہ اپنی بات پر قائم نہ رہا تو اس سے بیعانہ کی رقم دگنی وصول کی جائیگی۔ اور یہ بات بھی معاہدے کا حصہ ہوتی ہے کہ معاہدہ بیعانہ کرنے والا اس معاہدے کی بنیاد پر کسی تیسرے فریق کو فروخت کرنا چاہے تو مالک کو کوئی اعتراض نہ ہوگا، بیعانہ دینے والا جس خریدار کا نام پیش کرے گا مالک اس کے نام ملکیت منتقل کرنے کا پابند ہوگا، بسا اوقات بیعانہ دینے والا کچھ منافع لے کر آگے فروخت بھی کر دیتا ہے۔ شرعی لحاظ سے اس طرح آگے فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ معاہدہ بیعانہ کرنے والا جائیداد مذکور کا ابھی مالک نہیں بنا۔ اگر اصل مالک دگنا بیعانہ ادا کر کے منحرف ہو جائے جیسا کہ بعض اوقات ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں نزاع پیدا ہوگا۔ ہاں اگر پراپرٹی مالک کے پاس منحرف ہونے کا اختیار نہ ہو یا سودا مکمل ہو چکا ہو صرف بقیہ رقم کی ادائیگی باقی ہو تو پھر آگے فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مالک کے انکار کی صورت میں اس سے دگنا بیعانہ وصول کرنا شرعی لحاظ سے درست نہیں ہے۔

❁ ملکیت کے بغیر فروخت کی تیسری صورت سٹاک مارکیٹ میں رائج Short Sales ہے اس میں فروخت کنندہ ایسے شیئرز بیچ دیتا ہے جو اس کی ملکیت میں نہیں ہوتے لیکن اسے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کلیئرنگ سے قبل مارکیٹ سے سستے داموں حاصل کر کے خریدار کے

حوالے کر دے گا، یہ غیر ملکیتی شیئرز کی بیع ہے جو ناجائز ہے۔ اگر مارکیٹ میں مندے کی بجائے تیزی غالب رہے تو Short Sales کرنے والوں کو اچھا خاصا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جب بھی سٹاک مارکیٹ کسی بڑے بحران سے دوچار ہوتی ہے اس میں نمایاں کردار اسی شارٹ سیل کا ہوتا ہے۔

قبضہ سے قبل فروخت نہ کریں

عصر حاضر میں خریدی گئی چیز کو قبضہ میں لئے بغیر آگے فروخت کرنے کا عام رواج ہے بالخصوص درآمدات میں سامان منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل کئی جگہ فروخت ہو چکا ہوتا ہے اور ظاہر ہے ہر خریدار کچھ منافع رکھ کر ہی آگے فروخت کرتا ہے اس لیے مارکیٹ پہنچتے پہنچتے اس چیز کی قیمت بڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک معاشی نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ بار برداری کے شعبہ سے وابستہ مزدوروں کا روزگار متاثر ہوتا ہے۔ یہ شریعت مطہرہ کے محاسن میں سے ہے کہ اس نے یہ قانون بنا دیا ہے جب کسی چیز کا سودا طے پا جائے اور خریدار اس کو آگے فروخت کرنا چاہتا ہو تو اس کو چاہیے وہ اسے قبضہ میں لے کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دے، اسی جگہ فروخت کرنا منع ہے۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

'مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهُ '

''جو غلہ خریدے وہ قبضہ سے قبل فروخت نہ کریں۔''[1]

جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

'كُنَّا فِي زَمَانِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ نَبْتَاعُ الطَّعَامَ فَيَبْعَثُ عَلَيْنَا مَنْ يَأْمُرُنَا بِانْتِقَالِهِ مِنَ الْمَكَانِ الَّذِي ابْتَعْنَاهُ فِيهِ إِلٰى مَكَانٍ سِوَاهُ قَبْلَ أَنْ نَبِيعَهُ '

''ہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں غلہ خریدتے تو آپ ہمارے پاس ایک شخص کو بھیجتے جو

[1] صحیح البخاری : کتاب البیوع باب بیع الطعام قبل ان یقبض

ہمیں حکم دیتا کہ ہم بیچنے سے قبل جہاں سے خریدا ہے وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جائیں۔"①

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

'نَهَى أَنْ تُبَاعَ السِّلَعُ حَيْثُ تُبْتَاعُ حَتَّى يَحُوزَهَا التُّجَّارُ إِلَى رِحَالِهِمْ'

"رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ سامان کو وہاں بیچا جائے یہاں سے خریدا گیا تھا حتی کہ تاجر اسے اپنے مقامات پر منتقل کر لیں۔"②

جو تاجر اس حکم کی تعمیل نہ کریں ان کے خلاف تادیبی کارروائی بھی کی جا سکتی ہے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

'رَأَيْتُ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ الطَّعَامَ مُجَازَفَةً يُضْرَبُونَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَبِيعُوهُ حَتَّى يُئْوُوهُ إِلَى رِحَالِهِم'

"میں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تخمینے سے اناج خریدنے والوں کی پٹائی ہوتی دیکھی یہاں تک کہ وہ اس کو اٹھا کر اپنے ٹھکانوں میں منتقل کر دیں پھر فروخت کریں۔"③

ان مذکورہ احادیث کی روشنی میں ثابت ہوا کہ تاجروں کے لیے یہ جائز نہیں کہ منقولی اشیاء اپنی تحویل میں لے کر دوسری جگہ منتقل کیے بغیر فروخت کریں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے کہ چیز اٹھائے بغیر شرعی قبضہ ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ شارح بخاری علامہ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'وَيُعْرَفُ مِنْ ذَلِكَ أَنَّ اخْتِيَارَ الْبُخَارِيِّ أَنَّ اسْتِيفَاءَ الْمَبِيعِ الْمَنْقُول

---

① صحیح مسلم کتاب البیوع باب بطلان بیع المبیع قبل القبض .

② سنن ابی داود باب فی بیع الطعام قبل ان یستوفی .

③ صحیح البخاری باب ما یذکر فی بیع الطعام .

مِنَ الْبَائِعِ وَتَبْقِيَتَهُ فِي مَنْزِلِ الْبَائِعِ لَا يَكُونُ قَبْضًا شَرْعِيًّا حَتَّى يَنْقُلَهُ الْمُشْتَرِي إِلَى مَكَانٍ لَا اخْتِصَاصَ لِلْبَائِعِ بِهِ'

''اس سے پتا چلتا ہے کہ امام بخاری کا نقطہ نظر یہ ہے کہ منقولی چیز کو فروخت کنندہ سے وصول پانا اور اسے فروخت کنندہ کے ٹھکانے پر ہی رکھ چھوڑنا شرعی قبضہ نہیں ہے تا آنکہ خریدار اسے ایسی جگہ لے جائے جو فروخت کنندہ کے لیے مخصوص نہ ہو۔''①

ممانعت کا سبب

نامور تابعی حضرت طاؤس رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے قبضہ سے قبل فروخت کرنے کی ممانعت کا سبب پوچھا تو انہوں فرمایا:

'ذَاكَ دَرَاهِمُ بِدَرَاهِمَ وَالطَّعَامُ مُرْجًا'

''یہ درہم کے بدلے درہم کا لین دین ہے جبکہ غلہ وہیں پڑا ہوا ہے۔''②

یعنی سودی لین دین کے مشابہ ہونے کی بنا پر ناجائز ہے اس کی توضیح یوں ہے مثلاً خالد نے ایک لاکھ کی گندم خریدی اور وہاں سے منتقل کئے بغیر ایک لاکھ دس ہزار میں فروخت کر دی تو گویا اس نے رقم دی اور رقم ہی لی اور اس پر نفع کمایا، عملی طور پر کوئی خدمت انجام نہیں دی۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی اسی علت کی تحسین فرمائی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

'وَهَذَا التَّعْلِيلُ أَجْوَدُ مَا عُلِّلَ بِهِ النَّهْيُ؛ لِأَنَّ الصَّحَابَةَ أَعْرَفُ بِمَقَاصِدِ الرَّسُولِ ﷺ'

''ممانعت کی باقی وجوہ کی نسبت یہ وجہ بہترین ہے کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نبی ﷺ کے مقاصد کو بہتر جانتے ہیں۔''③

---

① فتح الباری ج4،ص443.

② صحیح بخاری: باب ما یذکر فی بیع الطعام

③ نیل الاوطار باب نهی المشتری عن بیع مااشتراہ قبل قبضه .

امام ابن قیم رحمہ اللہ ممانعت کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو قبضہ مکمل ہوا ہے اور نہ ہی فروخت کنندہ سے اس کا تعلق ختم ہوا ہے، لہذا جب وہ دیکھے گا کہ خریدار کو اس سے خوب نفع حاصل ہو رہا ہے تو وہ معاملہ فسخ کرنے اور قبضہ نہ دینے کا سوچ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے فسخ کے لیے بات ظالمانہ حیلوں، جھگڑے اور عداوت تک جا پہنچے جیسا کہ واقعات اس کے شاہد ہیں۔ چنانچہ حکمت پر مبنی شریعت کاملہ کی یہ خوبی ہے کہ اس نے خریدار پر یہ پابندی لگا دی ہے کہ جب تک خریدی گئی چیز پر قبضہ مکمل نہ ہو جائے اور فروخت کنندہ سے اس کا تعلق ختم نہ ہو اور اس سے چھڑا نہ لی جائے وہ اس میں تصرف نہ کرے تا کہ وہ بیع فسخ کرنے اور قبضہ نہ دینے کا سوچ نہ سکے۔ یہ وہ فوائد ہیں جن کو شارع نے نظر انداز نہیں کیا، حتی کہ وہ تاجر بھی انہیں مدنظر رکھتے ہیں جن کو شریعت کا علم نہیں کیونکہ ان کے خیال میں مصلحت بھی اسی میں ہے اور خرابیوں کا سد باب بھی اسی طرح ہوسکتا ہے۔''[1]

اس کا مطلب یہی ہے کہ جب تک خریدار فروخت کنندہ کے قبضہ سے مال چھڑا کر اپنے قبضہ میں نہیں لے لیتا آگے فروخت نہ کرے تا کہ نزاع کا خطرہ نہ رہے۔ کیونکہ جب تک خریدار چیز اپنے قبضہ میں نہیں لیتا اس بات کا اندیشہ باقی رہتا ہے کہ فروخت کنندہ زیادہ نفع کے لالچ میں وہی چیز کسی اور کو فروخت نہ کر دے۔

بعض اہل علم کے نزدیک جب بیچی گئی چیز کے نقصان کی ذمہ داری خریدار کی طرف منتقل ہو جائے اور اس کے اختیار پر کوئی قدغن باقی نہ رہے تو قبضہ متحقق ہو جاتا ہے، حقیقی طور پر چیز کو منتقل کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے:

'لَا یَحِلُّ سَلَفٌ وَبَیْعٌ وَلَا شَرْطَانِ فِي بَیْعٍ وَلَا رِبْحُ مَا لَمْ یُضْمَنْ وَلَا

---

[1] تهذيب ج 5 ص 137.

بَیْعُ مَا لَیْسَ عِنْدَكَ'

''قرض اور بیع، ایک بیع میں دو شرطیں اور جس چیز کے نقصان کی ذمہ داری نہ لی گئی ہو اس کا منافع جائز نہیں اور نہ ہی اس چیز کی بیع درست ہے جو تیرے پاس موجود نہ ہو۔''[1]

ان حضرات کی دلیل حدیث کے یہ الفاظ ہیں:

''جس چیز کے نقصان کی ذمہ داری نہ لی گئی ہو اس کا منافع جائز نہیں۔''

ان حضرات کے بقول یہاں قبضہ سے قبل فروخت ممنوع ہونے کی وجہ رسک نہ لینا بیان ہوئی ہے، لہٰذا جب مال کے نقصان کی ذمہ داری خریدار کی طرف منتقل ہو جائے تو وہ آگے فروخت کر سکتا ہے دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری نہیں۔ مگر دو وجہ یہ استدلال درست نہیں ہے۔

1. یہ اوپر مذکور ان احادیث کے خلاف ہے جو اس امر پر صریح دلالت کر رہی ہیں کہ فروخت سے قبل نقل وحمل لازمی ہے۔
2. یہ استدلال فرمان رسول ﷺ کی حکمت کے خلاف ہے۔ چنانچہ امام ابن قیم رحمہ اللہ اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

''اس کی علت (کے تعین) نے بعض فقہاء کو مشکل میں ڈال دیا ہے حالانکہ یہ شریعت کے محاسن میں سے ہے کہ جب پوری طرح قبضہ نہیں ہوگا اور فروخت کنندہ کا اس سے تعلق ختم نہیں ہوگا تو وہ مشتری کو فائدہ ہوتا دیکھ کر معاملہ منسوخ کرنے اور قبضہ نہ دینے کا لالچ کرے گا۔ اور اگر قبضہ دے گا بھی تو آنکھیں بند کر کے اور نفع سے محرومی کا افسوس لئے ہوئے دے گا، چنانچہ اس کا نفس ادھر ہی متوجہ رہے گا اس کا طمع ختم نہیں ہو گا یہ مشاہدے سے ثابت ہے، لہٰذا یہ شریعت کا کمال اور خوبی ہے کہ جب تک چیز کو حاصل نہ کر لے اور اس کی ذمہ داری میں نہ آجائے نفع ممنوع ہے تاکہ فروخت کنندہ

[1] سنن الترمذی، باب ماجاء فی کراھیة بیع ما لیس عندك .

منسوخ کرنے سے مایوس ہو جائے اور اس کا تعلق ختم ہو جائے۔''[1]

اس سے ثابت ہوا کہ اگر مشتری نقصان کی ذمہ داری لے بھی لیتا ہے لیکن اپنے قبضہ میں نہیں لیتا تو بھی اسی جگہ فروخت نہیں کر سکتا کیونکہ یہ بات فرمان رسول ﷺ کی حکمت کے خلاف ہے۔

کیا یہ حکم صرف خوردنی اشیاء کے ساتھ خاص ہے

قبضہ سے قبل فروخت کی ممانعت کا حکم تمام اشیاء کے لئے ہے یا کہ کچھ مخصوص اشیاء کے بارے میں، اس میں فقہاء کا قدرے اختلاف ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک یہ حکم صرف خوردنی اجناس کے ساتھ خاص ہے، غیر خوردنی اشیاء اس میں شامل نہیں اور بعض کی رائے میں اس کا تعلق ان چیزوں سے ہے جن کا لین دین ماپ، ناپ، وزن اور گنتی کے ذریعے ہوتا ہے جبکہ بعض کے نزدیک اس حکم میں صرف ان اشیاء شامل ہیں جن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن ہو، جن اشیاء کا منتقل کرنا ممکن نہیں وہ اس حکم میں داخل نہیں لیکن صحیح اور راجح قول کے مطابق قبضہ سے قبل فروخت کی پابندی کا حکم کسی ایک یا چند اشیاء کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

'وَلا اَحسِبُ كُلَّ شيٍ إلّا مِثْلَهٗ'

''میرے خیال میں تمام اشیاء کا یہی حکم ہے۔''[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس کے بارے میں رقمطراز ہیں:

'وهذا القول هو الصحيح الذى نختاره'

''یہی قول صحیح ہے جس کو ہم پسند کرتے ہیں۔''[3]

---

[1] تهذيب ج 5 ص154,153۔

[2] صحيح بخارى باب بيع الطعام قبل ان يقبض ۔

[3] تهذيب ج 5 ص 132۔

اس کی تائید اوپر مذکورہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں غلے کی بجائے سامان کا تذکرہ ہے تاہم مختلف اشیاء کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت میں فرق ہے۔ منقولی اشیاء کا قبضہ تو ان کو دوسری جگہ منتقل کرنا ہے اور جن اشیاء کو دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن نہیں جیسے اراضی اور مکانات وغیرہ ہیں ان کا قبضہ صرف یہ ہے کہ فروخت کنندہ تمام رکاوٹیں دور کر کے مشتری کو تصرف کا پورا موقع فراہم کر دے۔اسی طرح جو اشیاء ہاتھ میں لے کر قبضہ کی جاتی ہیں جیسے کرنسی نوٹ ہیں ان کا قبضہ یہ ہے کہ ان کو ہاتھ میں لے لیا جائے۔

کموڈیٹی ایکسچینج میں کاروبار

جس طرح سٹاک مارکیٹ میں مختلف کمپنیوں کے حصص کا لین دین ہوتا ہے اسی طرح کموڈیٹی ایکسچینج (سوق تبادل السلع) میں مختلف اجناس جیسے خام تیل، چاندی، کپاس، چاول اور گندم وغیرہ کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔عصر حاضر میں قبضہ سے قبل فروخت کے سب سے زیادہ سودے کموڈیٹی ایکسچینج میں ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں کیونکہ یہاں تمام لین دین فیوچر سودوں (عقود مستقبلیات) یعنی ان سودوں کی شکل میں ہوتا ہے جن میں بیچی گئی چیز کی سپردگی اور قبضہ مستقبل کی کسی تاریخ پر طے ہوتا ہے۔چونکہ یہاں کاروبار کرنے والوں میں حقیقی خریدار جن کا مقصد چیز کا حصول ہو بہت کم ہوتے ہیں اس لئے قبضہ اور سپردگی کی نوبت شاذ ونادر ہی آتی ہے بلکہ قیمت بڑھتے ہی وہ چیز آگے فروخت کر دی جاتی ہے اور آخر میں قبضہ کے دن کی قیمت اور قیمت خرید کے درمیان فرق برابر کر لیا جاتا ہے۔اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھنا آسان ہو گا۔مثلاً ''الف'' نے مقامی کموڈیٹی مارکیٹ سے تین ہزار نو سو روپے میں چاندی کی ایک لاٹ خریدی جس کی سپردگی ایک ماہ بعد طے پائی لیکن اگلے ہی روز یا چند دن بعد اس کی قیمت بڑھ کر تین ہزار نو پچاس روپے ہو گئی تو اب ''الف'' ایک پچاس روپے منافع لے کر وہ لاٹ آگے فروخت کر دے گا۔اور پھر سپردگی کی تاریخ آنے تک اس لاٹ پر مسلسل سودے ہوتے رہتے ہیں۔جب سپردگی کی تاریخ آتی ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ آخری خریدار نے یہ لاٹ کس قیمت پر

خریدی تھی اور آج مارکیٹ میں اس کی قیمت کیا ہے۔فرض کیجئے آخری مشتری نے چار ہزار پچاس روپے میں خریدی تھی اور قبضہ کے دن اس کی قیمت چار ہزار ایک سو روپے ہوگئی تو اس کے کھاتے میں پچاس روپے کا اندراج کر دیا جائے گا اور اگر قبضہ کے دن قیمت کم ہو کر چار ہزار روپے رہ گئی تو اس کے کھاتے سے پچاس روپے منہا کر لئے جائیں گے۔

چونکہ یہاں نہ تو خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کا لین دین مقصود ہوتا ہے بلکہ نفع ونقصان کا فرق برابر کیا جاتا ہے جو کہ سٹہ ہے اس لئے یہ کاروبار حرام اور ناجائز ہے حتی کہ اگر قبضہ مقصود ہو تب بھی فیوچر معاملہ جائز نہیں کیونکہ فیوچر معاملات میں چیز کی سپردگی اور قیمت کی ادائیگی دونوں ادھار ہوتی ہیں جو شرعی اعتبار سے غلط ہے۔شریعت نے بیع سلم کی اسی صورت میں اجازت دی ہے جب مکمل قیمت پیشگی ادا کر دی جائے ،بصورت دیگر یہ ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع ہوگی جو کہ ممنوع ہے۔یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام بیع سلم کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بیان کرتے ہیں کہ معاملہ کرتے وقت مطلوبہ چیز کی مکمل قیمت ادا کرنا ضروری ہے۔چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

'ذهب جمهور الفقهاء من (الحنفية و الشافعية و الحنابلة) الى أن من شروط صحة السلم تسليم رأس ماله في مجلس العقد فلو تفرقا قبله بطل العقد'

''جمہور فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سلم کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی قیمت مجلس عقد میں ادا کی جائے۔اگر دونوں فریق ادائیگی سے قبل الگ الگ ہو گئے تو عقد باطل ہوگا۔''[1]

یہ بات صحیح ہے کہ مالکی فقہاء کے نزدیک دو، تین دن کی تاخیر ہو سکتی ہے کیونکہ یہ معمولی تاخیر ہے جو قابل برداشت ہے اور بعض اوقات تو اتنا وقت قبضہ لینے کی کارروائی میں بھی لگ جاتا ہے

---

[1] ج 25 ، ص 202.

تاہم اس استثناء کو فیوچر سودوں چسپاں نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں قبضہ کی مدت تین دن سے زائد ہوتی ہے اور یہ مدت باقاعدہ طے شدہ ہوتی ہے جبکہ مالکی فقہاء کے نزدیک بھی اگر عقد کے اندر یہ شرط ہو کہ قیمت تین دن کے بعد ادا کی جائے گی تو عقد ختم ہو جاتا ہے۔لہذا جو حضرات فیوچر سودوں کو بیع سلم پر قیاس کر کے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں ان کا موقف درست نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ایکسچینج انتظامیہ ادائیگی کی ذمہ دار ہوتی ہے اور بروکر کے پاس خریدار کے اکاؤنٹ میں رقم بھی موجود ہوتی ہے لہذا حکماً یہی سمجھا جائے گا کہ ادائیگی ہو چکی ہے مگر یہ توجیہ صحیح نہیں۔ایک تو اس لئے کہ فروخت کنندہ کو عملاً ادائیگی ضروری ہے کسی تیسرے شخص کے پاس جمع کرا دینا کافی نہیں ہے۔

اور دوسرا اس لئے کہ عموماً بروکر کے پاس پوری رقم جمع نہیں کرائی جاتی بلکہ رقم کا کچھ حصہ جمع کرا کر خریداری شروع کر دی جاتی ہے جبکہ سلم میں مکمل ادائیگی لازمی ہے۔

سودی طریقے اختیار نہ کریں

اصل میں تو سود اس فائدے کو کہا جاتا ہے جو قرض کے مقابلہ میں شرط اور تعین کے ساتھ لیا جائے یا پھر اس اضافے کو کہتے ہیں جو بیع کے نتیجے میں واجب ہونے والی رقم کی ادائیگی میں تاخیر پر لیا جائے لیکن شریعت محمدی نے خرید و فروخت کی کچھ صورتوں کو بھی سودی کاروبار میں شمار کیا ہے یا سود کی راہ ہموار ہونے کے خدشہ سے انہیں بھی حرام قرار دیا ہے،لہذا ان صورتوں سے بھی دور رہنا چاہیے۔وہ صورتیں یہ ہیں۔

1. ہم جنس چیزوں کا کمی بیشی کے ساتھ اور ادھار تبادلہ: جب دو ہم جنس اشیاء مثلاً گندم کا گندم کے ساتھ تبادلہ کیا جا رہا ہو تو اس میں دو شرطیں ضروری ہیں ایک تو دونوں طرف مقدار بالکل برابر ہو اور دوسرا مجلس میں لین دین نقد و نقد ہو۔چنانچہ اگر کسی طرف کی بیشی پائی جائے یا دونوں یا کسی ایک طرف ادھار ہو تو یہ معاملہ ربا الفضل ''اضافے والا سود'' کہلاتا ہے جو کہ

صریح حرام ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ يَدًا بِيَدٍ فَمَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبَى الآخِذُ وَالْمُعْطِي فِيهِ سَوَاءٌ'

''سونا،سونے کے بدلے اور چاندی،چاندی کے بدلے اور گندم،گندم کے بدلے اور جو،جو کے بدلے اور کھجور،کھجور کے بدلے اور نمک،نمک کے بدلے دونوں طرف سے برابر اور نقد و نقد ہو۔جس نے زائد دیا زائد کا مطالبہ کیا اس نے سود کا لین دین کیا۔اس میں لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں۔''①

دوسری حدیث میں ہے:

'فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هَذِهِ الأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ'

''جب یہ اشیاء مختلف ہوں تو جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ تبادلہ نقد و نقد ہو۔''②

علمائے کرام ان چھ اشیاء کو دو گروپوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

1. سونا،چاندی۔
2. گندم،جو،کھجور اور نمک۔

اور ان کے باہمی تبادلے کی جائز و ناجائز صورتیں یوں بیان کرتے ہیں۔

- ایک گروپ کی دو ایک جیسی چیزوں جیسے سونے کا سونے یا چاندی کا چاندی یا گندم کا گندم کے ساتھ آپس میں تبادلہ،اس میں کمی بیشی اور ادھار دونوں منع ہے۔ادھار نا جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دو ایک جیسی چیزوں میں حقیقی برابری تب ممکن ہے جب دونوں کی ادائیگی کا وقت بھی ایک ہو۔

---

① صحیح مسلم باب الصرف و بیع الذهب.

② صحیح مسلم باب بیع الصرف و بیع الذهب.

❁ ایک گروپ کی دو مختلف چیزوں کا تبادلہ جیسے سونے کا چاندی یا گندم کا چاول کے ساتھ باہم تبادلہ، اس میں کمی بیشی تو جائز ہے مگر ادھار جائز نہیں کیونکہ ادھار کی بیشی سودی مزاج پر دلالت کرتی ہے۔ وہ اس طرح جو شخص آج دس من گندم دے کر یہ طے کرتا ہے کہ وہ ایک مہینہ بعد پانچ من چاول لے گا تو اس کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ایک ماہ بعد پانچ من چاول دس من گندم کے برابر ہونگے۔ اس نے دونوں کے درمیان تبادلے کی جو نسبت پیشگی طے کر لی ہے یہ سودی ذہنیت کا ہی نتیجہ ہے جبکہ اس کے برعکس نقد تبادلہ ہمیشہ بازاری نرخ پر ہی ہوتا ہے اس لئے شریعت نے نقد تبادلے کو تو جائز قرار دیا ہے لیکن ادھار کی اجازت نہیں دی جیسا کہ درج بالا حدیث میں نقد و نقد کی شرط سے واضح ہے۔

❁ ایک گروپ کی کسی چیز کا دوسرے گروپ کی کسی چیز سے تبادلہ جیسے سونے کا گندم یا چاندی کا جو کے ساتھ تبادلہ کرنا، اس میں کمی بیشی بھی جائز ہے اور ادھار بھی۔

یہی حکم ان اشیاء کے باہمی تبادلے کا ہے جو حرمت کی علت میں ان چھ اشیاء کے ساتھ شریک ہیں۔ اب ان اشیاء کی حرمت کی علت کیا ہے اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ سونے اور چاندی میں حرمت کی وجہ ان کا ثمن (زر) ہونا ہے، لہٰذا موجودہ دور کی کرنسی کو ان پر قیاس کیا جائے گا اور ایک ملک کی کرنسی کا اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ اور ادھار تبادلہ حرام ہوگا جبکہ باقی چار اجناس میں حرمت کی وجہ قابل غذا و ذخیرہ ہونا ہے، لہٰذا وہ تمام اشیاء غذائی اشیاء جنہیں ذخیرہ کیا جا سکتا ہے ان کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ممنوع ہے۔

ظاہر ہے ایک قسم کی دو چیزوں کے درمیان تبادلہ ادنی اور اعلی (Quality) کی بنیاد پر ہی ہوگا کہ ایک طرف عمدہ گندم ہوگی اور دوسری طرف کم تر۔ لیکن کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ سود کا سبب بن سکتا ہے اس لئے شریعت نے یہ اصول بنا دیا ہے کہ یا تو کوالٹی کا فرق نظر انداز کر کے لین دین کیا جائے یا پھر اپنی چیز بیچ کر مطلوبہ چیز خرید لی جائے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

’جَاءَ بِلَالٌ إِلَی النَّبِیِّ ﷺ بِتَمْرٍ بَرْنِیٍّ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ ﷺ مِنْ أَیْنَ هٰذَا قَالَ بِلَالٌ کَانَ عِنْدَنَا تَمْرٌ رَدِیٌّ ، فَبِعْتُ مِنْهُ صَاعَیْنِ بِصَاعٍ ، لِنُطْعِمَ النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ عِنْدَ ذٰلِكَ أَوَّهْ أَوَّهْ عَیْنُ الرِّبَا عَیْنُ الرِّبَا ، لَا تَفْعَلْ ، وَلٰکِنْ إِذَا أَرَدْتَ أَنْ تَشْتَرِیَ فَبِعِ التَّمْرَ بِبَیْعٍ آخَرَ ثُمَّ اشْتَرِهٖ‘

’’ایک دفعہ بلال نبی ﷺ کے پاس عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر آئے۔آپ نے پوچھا یہ کہاں سے لائے ہو؟انھوں نے عرض کیا ہمارے پاس گھٹیا قسم کی کھجور تھی میں نے وہ دو صاع دے کر ایک صاع خرید لی تا کہ نبی ﷺ کو عمدہ کھجوریں کھلائیں۔نبی ﷺ نے فرمایا ہائیں یہ قطعی سود ہے یہ قطعی سود ہے ایسا ہرگز نہ کرو۔جب تم عمدہ کھجوریں خریدنا چاہو تو اپنی کھجوریں کسی دوسری چیز کے عوض بیچ دو پھر اس سے عمدہ کھجوریں خریدلو۔‘‘[1]

اسی طرح اگر کسی چیز میں سونا اور دوسری اشیاء مخلوط ہوں تو جب تک سونے کو علیحدہ نہ کر لیا جائے اس کو اسی حالت میں متعین سونے کے عوض بیچنا جائز نہیں ہے۔چنانچہ سیدنا فضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

’أُتِیَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ بِخَیْبَرَ بِقِلَادَةٍ فِیهَا خَرَزٌ وَذَهَبٌ وَهِیَ مِنَ الْمَغَانِمِ تُبَاعُ فَأَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِالذَّهَبِ الَّذِی فِی الْقِلَادَةِ فَنُزِعَ وَحْدَهُ ثُمَّ قَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَزْنًا بِوَزْنٍ‘

’’خیبر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہار لایا گیا جس میں کوڑیاں اور سونا تھا۔وہ مال غنیمت میں سے تھا اور فروخت کیا جارہا تھا۔آپ ﷺ نے ہار میں موجود سونے کے بارے میں فرمایا تو اسے الگ کر دیا گیا پھر آپ نے ان سے کہا سونا سونے کے

[1] صحیح البخاری باب اذا باع الوکیل شیأ،صحیح مسلم بیع الطعام مثلا بمثل .

ساتھ وزن کرکے فروخت کیا جائے۔"[1]

دوسری روایت فضالہ بن عبید فرماتے ہیں:

"میں نے خیبر کے روز بارہ دینار کے عوض ایک ہار خریدا جس میں سونا اور کوڑیاں تھیں۔ میں نے اس کو الگ الگ کیا تو اس میں بارہ دینار سے زائد سونا پایا۔ میں نے اس بات کا تذکرہ آنحضور ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا جب تک جدا جدا نہ کرلیا جائے بیچا نہ جائے۔"[2]

حتی کہ اگر ہم سونے یا چاندی کی بنی ہوئی کوئی چیز خریدیں تو اس صورت میں بھی یہی حکم ہے کہ اس کی قیمت میں اس کے وزن سے زائد سونا یا چاندی دینا جائز نہیں کیونکہ اس کی آڑ میں سودی مرض کو در آنے کا موقع مل سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت مجاہد کہتے ہیں:

"کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا کہ ان کے پاس ایک سنار آیا اس نے کہا اے ابوعبدالرحمان (عبداللہ بن عمر کی کنیت) میں سونے کو ڈھالتا ہوں پھر زیادہ وزن پر فروخت کردیتا ہوں اور اپنے ہاتھ کی محنت کے بقدر بچا لیتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے ان کو منع کردیا تاہم وہ سنار بار بار مسئلہ پیش کرنے لگا اور عبداللہ بن عمر اسے منع کررہے تھے یہاں تک مسجد کے دروازے تک یا جس سواری پر سوار ہونا چاہتے تھے اس تک پہنچ گے، پھر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا دینار دینار اور درہم درہم کے بدلے ان میں تفاضل جائز نہیں ہے۔ یہ ہمارے نبی کا ہم سے عہد ہے اور ہمارا تمھارے ساتھ عہد ہے۔"[3]

اس طرح کا ایک واقعہ حضرت عطاء بن یسار سے بھی مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

---

[1] صحیح مسلم باب بیع القلادۃ فیھا خرز .

[2] حوالہ مذکورہ۔

[3] مؤطا امام مالك : كتاب البيوع، باب بيع الذهب بالفضة تبرا و عينا

'أَنَّ مُعَاوِيَةَ بَاعَ سِقَايَةً مِنْ ذَهَبٍ أَوْ وَرِقٍ بِأَكْثَرَ مِنْ وَزْنِهَا فَقَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهَى عَنْ مِثْلِ هٰذَا إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ '

''ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سونے یا چاندی کی بنی ہوئی ایک مشک اس کے وزن سے زائد وزن کے عوض فروخت کی تو حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ اس طرح کے سودے سے منع کرتے تھے سوائے اس کے کہ برابر برابر ہو۔''[1]

2. بیع محاقلہ وبیع مزابنہ: سودی خرید وفروخت کی دوسری صورت بیع محاقلہ اور بیع مزابنہ ہے۔ بیع محاقلہ کا معنی ہے خوشہ میں موجود کھیتی کو اسی جنس کی ایک معلوم مقدار کے عوض بیچنا مثلا ایک ایکڑ گندم کی فصل کو پچاس من گندم کے بدلے فروخت کرنا۔ جبکہ مزابنہ کا معنی ہے درخت کی شاخوں پر موجود پھل کو اسی قسم کے اتارے ہوئے پھل کے بدلے بیچنا۔

چونکہ ایک قسم کی دو چیزوں کے باہمی تبادلے میں حقیقی برابری شرط ہے جبکہ ان صورتوں میں ایک طرف کی مقدار تو معلوم و متعین ہوتی ہے اور دوسری جانب محض اندازہ و تخمینہ ہوتا ہے جس کے برابر ہونے کا یقین نہیں ہوتا اس لئے یہ دونوں قسمیں حرام ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

'نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ '

''نبی ﷺ نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے۔''[2]

صحیح مسلم میں ہے:

'أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الثَّمَرِ بِالتَّمْرِ وَقَالَ ذٰلِكَ الرِّبَا تِلْكَ الْمُزَابَنَةُ '

---

① سنن النسائی: باب بیع الذھب بالذھب

② صحیح البخاری: کتاب البیوع، باب بیع المزابنة

''رسول اللہ ﷺ نے درخت پر لگی کھجوروں کو خشک کھجوروں کے بدلے بیچنے سے منع فرمایا اور کہا یہ سود ہے۔اس کو مزابنہ کہتے ہیں۔''[1]

حتی کہ اگر دونوں جانب کی مقدار معلوم ہو تب بھی تازہ اور خشک پھل کا باہم تبادلہ جائز نہیں کیونکہ تازہ پھل خشک ہونے پر کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُسْأَلُ عَنِ اشْتِرَاءِ التَّمْرِ بِالرُّطَبِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَيَنْقُصُ الرُّطَبُ إِذَا يَبِسَ فَقَالُوا نَعَمْ فَنَهَى عَنْ ذَلِكَ))

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ سے تازہ کھجوروں کے بدلے خشک کھجور کی بیع کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تازہ کھجوریں خشک ہو کر کم ہو جاتی ہیں صحابہ نے کہا جی ہاں تو آپ نے اس سے منع فرمادیا۔''[2]

3. بیع العینہ: سودی خرید وفروخت کی تیسری شکل بیع العینہ (Buy Back) ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ فروخت کنندہ ایک چیز ادھار بیچ کر دوبارہ کم قیمت پر نقد خرید لیتا ہے یا نقد خرید کر دوبارہ اسی شخص کو ادھار زائد قیمت پر بیچ دیتا ہے۔ یہ اصل میں سود لینے کا ایک حیلہ ہے کہ اگر آپ کسی کو سال کیلئے ایک ہزار روپیہ قرض دے کر بارہ سو لینا چاہتے ہیں تو اس کو ایک سال کیلئے کوئی چیز ادھار بارہ سو میں فروخت کر دیں۔ بعد ازاں اس سے وہی چیز نقد ایک ہزار میں خرید لیں تا کہ قرض کے خواہشمند کی ضرورت بھی پوری ہو جائے اور آپ کو بھی سال بعد بارہ سو مل جائیں۔ چونکہ یہ سودی لین دین کی ہی ایک شکل ہے جس میں چیز کو بطور حیلہ استعمال کیا جاتا ہے اس لئے حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم باب تحريم بيع الرطب .

[2] مؤطا امام مالك باب مايكره من بيع التمر .

'إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتَّى تَرْجِعُوا إِلَى دِينِكُمْ'

''جب تم بیع عینہ کرنے لگ جاؤ گے اور بیلوں کی دُمیں پکڑ لو گے (زراعت میں مشغول ہو جاؤ گے) اور کھیتی باڑ پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کردے گا حتی کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ۔''[1]

بعض فقہاء کے نزدیک اپنے ذمے دَین (Debt) کی ادائیگی کے لئے حصول قرض کے خواہاں شخص کو کوئی چیز ادھار زائد قیمت پر بیچنا تاکہ وہ اس کو بازار میں نقد کم قیمت پر فروخت کر کے اپنا دَین ادا کر سکے یہ صورت بھی بیع عینہ میں شامل ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی معروف کتاب الدر المختار میں بیع العینہ کی تشریح میں مرقوم ہے:

'بَيْعُ الْعَيْنِ بِالرِّبْحِ نَسِيئَةً لِيَبِيعَهَا الْمُسْتَقْرِضُ بِأَقَلَّ لِيَقْضِيَ دَيْنَهُ ، اخْتَرَعَهُ أَكَلَةُ الرِّبَا ، وَهُوَ مَكْرُوهٌ مَذْمُومٌ شَرْعًا لِمَا فِيهِ مِنَ الْإِعْرَاضِ عَنْ مَبَرَّةِ الْإِقْرَاضِ'

''کسی چیز کو ادھار زائد قیمت پر بیچنا تاکہ قرض کا طالب کم قیمت پر بیچ کر اپنے ذمے دَین ادا کر سکے اسے سود خوروں نے ایجاد کیا ہے اور یہ شرعاً مکروہ اور مذموم ہے کیونکہ اس میں قرض کی نیکی سے اعراض پایا جاتا ہے۔''[2]

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

'فَيَأْتِي إِلَى تَاجِرٍ فَيَطْلُبُ مِنْهُ الْقَرْضَ وَيَطْلُبُ التَّاجِرُ مِنْهُ الرِّبْحَ وَيَخَافُ مِنَ الرِّبَا فَيَبِيعُهُ التَّاجِرُ ثَوْبًا يُسَاوِي عَشَرَةً مَثَلًا بِخَمْسَةَ عَشَرَ نَسِيئَةً فَيَبِيعُهُ هُوَ فِي السُّوقِ بِعَشَرَةٍ فَيَحْصُلُ لَهُ الْعَشَرَةُ وَيَجِبُ عَلَيْهِ لِلْبَائِعِ

---

[1] سنن ابی داؤد: باب فی النهی عن العينة.

[2] رد المحتار مطلب بيع العينة .

خَمْسَةَ عَشَرَ إِلَى أَجَلٍ'

''وہ کسی تاجر کے پاس آ کر قرض مانگے اور تاجر اس سے منافع کا مطالبہ کرے لیکن ساتھ ہی سود کا بھی خوف ہے۔ چنانچہ تاجر اس کو دس کا کپڑا ادھار پندرہ میں فروخت کر دیتا ہے پھر وہ وہی کپڑا بازار میں (نقد) دس کا بیچ دیتا ہے اور اس طرح اسے دس روپے حاصل ہو گئے تاہم بائع کے اس کے ذمے ادھار پندرہ ہیں۔''[1]

یہاں یہ امر نگاہ میں رہے کہ درمختار میں عینہ کی جس صورت کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ رقم کا ضرورت مند کوئی چیز ادھار مہنگے داموں خرید کر فروخت کنندہ کے علاوہ کسی تیسرے شخص کو نقد سستے داموں بیچ دے یہ صورت 'بیعُ التَوَرُّق' کہلاتی ہے جو صحیح رائے کے مطابق ناجائز ہے مگر بعض اسلامی بینکوں میں بھرپور طریقے سے اس کا استعمال جاری ہے۔

اسلامی بینکوں میں عموماً یہ طریقہ نقد سرمائے (Liquidity) کا انتظام کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جس بینک کو سرمائے کی ضرورت ہو وہ دوسرے بینک جس کے پاس اضافی سرمایہ موجود ہوتا ہے سے کوئی مخصوص چیز کچھ فیصد شرح منافع کے عوض مرابحہ کی بنیاد پر خرید لیتا ہے۔ بعد میں بینک یہ چیز ایجنٹ کے ذریعے مارکیٹ میں فروخت کر کے اپنی ضرورت کے مطابق سرمایہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ حقیقت میں تورق ہے جو حنفی فقہاء کے نزدیک بیع عینہ کی ایک شکل ہے مگر اسلامی بینک اعتراضات سے بچنے کیلئے اس کو Murabaha Reverse کا نام دے دیتے ہیں۔

4. قرض کی شرط پر خرید وفروخت: بیع کی ممنوعہ صورتوں میں سے ایک صورت قرض دینے کی شرط پر کوئی چیز بیچنا یا خریدنا یا قرض دینے کے بدلے خرید وفروخت کی شرط لگانا ہے۔ یہ صورت چونکہ اس خطرے سے خالی نہیں کہ قرض دہندہ اگر فروخت کنندہ ہے تو وہ بازار

---

[1] رد المحتار مطلب بيع العينة .

سے زائد منافع وصول کر لے یا اگر خریدار ہے تو قرض لینے والے کو کم منافع دے اور یوں معاملہ میں سود کی آمیزش ہو جائے اس لئے نبی ﷺ نے اسے ممنوع قرار دیا ہے:

'أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ نَهَى عَنْ سَلَفٍ وَبَيْعٍ '

''رسول اللہ ﷺ نے قرض اور بیع سے منع فرمایا ہے۔''[1]

محدث جلیل امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'أن النبي ﷺ نهى أن يجمع الرجل بين سلف وبيع ومعلوم أنه لو أفرد أحدهما عن الآخر صح وإنما ذاك لأن اقتران أحدهما بالآخر ذريعة إلى أن يقرضه ألفا ويبيعه سلعة تساوى ثمانمائة بألف أخرى فيكون قد أعطاه ألفا وسلعة بثمانمائة ليأخذ منه ألفين وهذا هو معنى الربا فانظر إلى حمايته الذريعة إلى ذلك بكل طريق'

''بلاشبہ نبی ﷺ نے منع کیا کہ کوئی شخص قرض اور بیع کا معاملہ جمع کرے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ اگر ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے الگ کر کے انجام دیا جاتا تو وہ صحیح ہوتا۔ لیکن دونوں کو جمع کرنے کی ممانعت اس لئے فرمائی کہ ایک معاملے کو دوسرے کے ساتھ ملانا سودی لین دین کا ذریعہ بن سکتا ہے وہ اس طرح کہ وہ مشتری کو ایک ہزار قرض دے اور آٹھ سو کا سامان الگ سے ایک ہزار کے عوض فروخت کر دے تو اس طرح اس نے مشتری کو ایک ہزار (قرض) دیا اور آٹھ سو کی مالیت کا سامان (ایک ہزار میں) فروخت کر دیا تا کہ اس سے دو ہزار وصول پائے اور سود کا معنی بھی یہی ہے۔ دیکھو! نبی ﷺ نے سودی ذرائع سے ہر طریقے سے بچایا ہے۔''[2]

---

[1] سنن النسائی، باب سلف وبيع ـ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل يبيع ماليس عنده ـ سنن الترمذی باب ماجاء فی كراهية بيع ما ليس عندك.

[2] اعلام الموقعين: ج3، ص 141.

علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'ولو باعه بشرط أن يسلفه أو يقرضه أو شرط المشترى ذلك عليه فهو محرم والبيع باطل'

''اور اگر بائع مشتری کو اس شرط پر بیچے کہ وہ اسے قرض دے گا یا مشتری بائع پر اس کی شرط لگائے تو یہ حرام ہے اور بیع باطل ہے۔''[1]

نقص نہ چھپائیں

دین اسلام خیر خواہی کا دین ہے اس لیے مسلمان تاجر پر لازم ہے کہ لین دین کے وقت سچائی سے کام لے اور خریدار پر حقیقت حال واضح کرے، مال کے نقص کو نہ چھپائے، ملاوٹ، مکر وفریب، جھوٹ اور دھوکہ دہی سے مکمل اجتناب کرے، یہ سوچ نہ رکھے کہ سچ بولنے سے منافع میں کمی واقع ہوگی کیونکہ سچ بولنے سے اللہ تعالی تھوڑے منافع میں بھی برکت ڈال دیتا ہے جبکہ جھوٹ سے حاصل کیا ہوا زیادہ منافع بھی بے برکت ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

'فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا ، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا'

''اگر وہ دونوں (تاجر اور گاہک) سچ بولیں اور ایک دوسرے پر حقیقت حال واضح کر دیں تو ان کے سودے میں برکت ہوگی، اور اگر دونوں نے جھوٹ بالا اور عیب کو چھپایا تو ان کے سودے سے برکت مٹادی جائے گی۔''[2]

فریقین کو چاہیے کہ وہ معاملہ کرتے وقت ہمیشہ اس حدیث کو پیش نظر رکھیں۔ بعض دوکاندار

---

[1] المغنی ج 6، ص 334 .

[2] صحیح البخاری کتاب البیوع: باب ما یمحق الکذب

چیز کا نقص واضح نہیں کرتے بلکہ اس کی ذمہ داری خریدار پر ڈال دیتے ہیں کہ آپ خود دیکھ لیں اگر بعد میں کوئی نقص نکلا تو ہم ذمہ دار نہ ہونگے حالانکہ ان کو اس کا علم ہوتا ہے یہ طریقہ خلاف شریعت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

'اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ وَلَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ بَاعَ مِنْ أَخِیهِ بَیْعًا فِیهِ عَیْبٌ إِلَّا بَیَّنَهُ لَهُ'

''ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو ایسی چیز بیچے جس میں عیب ہو سوائے اس کے کہ وہ اس پر واضح کردے۔''[1]

یعنی فروخت کنندہ کو چاہیے کہ وہ خریدار پر واضح کرے کہ مال میں یہ نقائص ہیں۔ مال کے عیوب چھپانا کتنا عظیم جرم ہے، اس کی سنگینی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایسے لوگوں سے بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان فرمایا ہے جو چیز کا عیب ظاہر کیے بغیر فروخت کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

'أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ عَلَى صُبْرَةِ طَعَامٍ فَأَدْخَلَ یَدَهُ فِیهَا فَنَالَتْ أَصَابِعُهُ بَلَلًا فَقَالَ مَا هٰذَا یَا صَاحِبَ الطَّعَامِ قَالَ أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ یَارَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ کَیْ یَرَاهُ النَّاسُ مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنِّی'

''بے شک رسول اللہ ﷺ غلّے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے تو آپ نے اپنا ہاتھ اس ڈھیر میں داخل کیا، آپ کی انگلیوں نے گیلا پن محسوس کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے غلّے والے یہ کیا ہے؟ اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اس پر بارش پڑ گئی تھی۔

---

[1] سنن ابن ماجه باب من باع عیبا فلیبینه وقال ابن حجر فی الفتح اسناده حسن .

آپ نے فرمایا تم نے اس بھیگے ہوئے غلے کو اوپر کیوں نہ کر دیا تا کہ لوگ اس کو دیکھ سکتے، اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا جس نے دھوکا دیا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔"[1]

یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ تاجر نے غلے کو خود گیلا نہیں کیا تھا محض گیلے حصے کو چھپایا تھا مگر نبی ﷺ نے اسے بھی قابل گرفت قرار دیا کیونکہ ناقص خوراک سے لوگوں کی صحت پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس سے متعدد بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ کم روشنی میں گاہک کے سامنے مال پیش کرنا یا مال کی دو تہیں ہوں تو صرف عمدہ تہہ دکھانا اور مال کی بے جا تعریف کرنا بھی دھوکہ دہی میں داخل ہے۔

ناپ تول میں کمی نہ کریں

دھوکا دہی اور فریب کی بدترین قسم ناپ تول میں کمی ہے، جو لوگ اس سنگین جرم کے مرتکب ہیں وہ اسلام کی نگاہ میں قابل نفرت اور سخت سزا کے مستحق ہیں۔ قرآن مجید نے اس جرم کی شناعت وقباحت اور اخروی سزاؤں بیان فرمائی ہے:

﴿وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ O الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ O وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ O﴾

"ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔"[2]

حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم میں مبعوث کیے گئے ان میں شرک کے علاوہ ایک نمایاں بیماری

---

[1] صحیح مسلم: باب قول النبی من غشنا.

[2] المطففین: 1، 2، 3.

یہ بھی تھی کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے، حالانکہ یہ بڑے آسودہ حال تھے۔ جب یہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کی نصیحت پر بھی باز نہ آئے تو اللہ تعالی نے ان پر آگ برسا کر ان کو مال ودولت سمیت تباہ کردیا۔ یہ عذاب اس طرح آیا کہ پہلے سات دن تک ان پر سخت گرمی اور دھوپ مسلط کردی، اس کے بعد بادلوں کا ایک سایہ آیا، چونکہ یہ لوگ سات دن کی سخت گرمی سے بلبلائے ہوئے تھے اس لیے سب سائے تلے جمع ہوگئے تاکہ ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھائیں۔لیکن چند لمحے بعد ہی آسمان سے آگ کے شعلے برسنا شروع ہوگئے، زمین زلزلے سے لرز اٹھی اور ایک سخت چنگھاڑ نے انہیں ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔قرآن حکیم نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ سے اشارہ کیا ہے:

﴿فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾

''انہوں نے اسے (شعیب علیہ السلام کو) جھٹلایا تو انہیں سائبان والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔ وہ بڑے بھاری دن کا عذاب تھا۔''[1]

امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

'وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِلَّا أُخِذُوا بِالسِّنِينَ وَشِدَّةِ الْمَؤُنَةِ وَجَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ'

''جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اس پر قحط سالی، سخت محنت اور حکمرانوں کا ظلم مسلط کردیا جاتا ہے۔''[2]

چونکہ ناپ تول میں ڈنڈی مارنا ظلم ہے جس کی دین اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں۔اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ دیتے وقت ذرا جھکتا ہوا دیا جائے۔فرمان نبوی ہے:

'إِذَا وَزَنْتُمْ فَأَرْجِحُوا'

---

[1] الشعراء :189.

[2] سنن ابن ماجه : باب العقوبات.

''جب تول کرو تو جھکتا ہوا دو۔''[1]

قسمیں نہ کھائیں

بعض تاجر اگر جھوٹی قسمیں کھا کر دھوکا دہی کے مرتکب ہوتے ہیں تو بعض گاہکوں کو مطمئن کرنے کے لیے بہت زیادہ قسمیں کھاتے ہیں، جھوٹی قسم تو بدترین گناہ ہے، روز قیامت اللہ تعالی ایسے لوگوں کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا لیکن سچی قسم سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ چنانچہ حدیث کی مستند اور اعلی ترین کتاب صحیح بخاری میں ایک عنوان یوں باندھا گیا ہے۔

'بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنَ الْحَلِفِ فِي الْبَيْعِ'

''خرید وفروخت میں قسمیں کھانا مکروہ ہیں۔''

شارح بخاری علامہ ابن حجر رحمہ اللہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''یہ کراہت مطلق ہے اگر قسم جھوٹی ہوگی تو مکروہ تحریمی اور اگر سچی ہوگی تو مکروہ تنزیہی ہوگی۔''[2]

یعنی سچی قسم سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے۔[3]

ارشاد نبوی کے مطابق یہ عادت برکت کھو دینے کا باعث ہے کیونکہ دنیاوی مفاد کے لیے اللہ تعالی کے بابرکت نام کا استعمال غیر مناسب ہے اور بالآخر جب لوگ ایسے تاجر کی عادت سے واقف ہو جاتے ہیں تو پھر اس کی قسموں پر یقین نہیں کرتے یوں اس کی دکانداری خراب ہوتی ہے کیونکہ کاروبار اعتماد پر ہی چلتا ہے اور جب کسی تاجر کی ساکھ متاثر ہوتی ہے تو اس کی تجارت خسارے میں چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے اسلام نے قسمیں کھا کر مال بیچنے سے منع کیا ہے حضرت

---

① سنن ابن ماجه: باب الرجحان فی الوزن

② فتح الباری ج 4، ص400.

③ عمدة القاری ج8 ص355.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'اَلْحَلِفُ مُنَفِّقَةٌ لِلسِّلْعَةِ مُمْحِقَةٌ لِلْبَرَكَةِ '

''قسم تجارت کو خوب چلاتی ہے مگر برکت کو ختم کر دیتی ہے۔''①

حضرت ابوقتادۃ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

'إِيَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الْحَلِفِ فِي الْبَيْعِ فَإِنَّهُ يُنَفِّقُ ثُمَّ يَمْحَقُ '

''بیع میں زیادہ قسمیں کھانے سے بچو کیونکہ یہ چیز فروخت تو کر دیتی ہے مگر اس کی برکت ختم کر دیتی ہے۔''②

نرم رویہ اختیار کریں

کاروباری معاملات اور لین دین میں دوسرے فریق کو رعایت اور سہولت دینا اللہ تعالی کو بہت محبوب ہے یہی وجہ ہے اسلام یہ تلقین کرتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے ساتھ فراخدلی، نرمی اور سیر چشمی کا مظاہرہ کریں، بنیے کی طرح سخت اور بے لچک رویہ اختیار نہ کریں۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

'رَحِمَ اللَّهُ رَجُلًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ ، وَإِذَا اشْتَرَى ، وَإِذَا اقْتَضَى '

''اللہ تعالی اس آدمی پر رحم فرمائے جو بیچتے، خریدتے اور تقاضا کرتے وقت نرمی کرتا ہے۔''③

دوسری روایت میں ہے:

'أفضل المؤمنين رجل سمح البيع، سمح الشراء، سمح القضاء، سمح الاقتضاء'

---

① صحيح بخاری باب يمحق الله الربا .

② صحيح مسلم باب النهى عن الحلف فى البيع .

③ صحيح البخاری كتاب البيوع: باب السهولة و السماحة فى الشراء و البيع

’’بہترین مومن وہ ہے جو خرید وفروخت، قرض کی ادائیگی اور مطالبہ میں نرم ثابت ہوتا ہے۔‘‘[1]

بعض اوقات چیز خریدنے کے بعد انسان کو اس کی ضرورت نہیں رہتی یا وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی' اس صورت میں اگرچہ شریعت دوسرے فریق کو مجبور تو نہیں کرتی کہ وہ ضرور واپس کرے لیکن اگر وہ ایسا کرلے تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللَّهُ عَثْرَتَهُ ‘

’’جو مسلمان کا سودا واپس کرے گا اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی غلطیوں سے درگزر فرمائے گا۔‘‘[2]

ہمارے ہاں بعض دکان داروں نے یہ عبارت لکھ کر آویزاں کی ہوتی ہے

’’خریدا ہوا مال واپس یا تبدیل نہیں ہوگا‘‘

یہ رویہ نہ تو اس جذبہ اخوت ومحبت کے مطابق ہے جس کی تعلیم اسلام اپنے ماننے والوں کو دیتا ہے اور نہ ہی کاروباری لحاظ سے فائدہ مند، کیونکہ جب کسی تاجر کی یہ شہرت ہوجائے کہ وہ خریدی گئی چیز واپس یا تبدیل نہیں کرتا تو لوگ اس کی دکان پر جانے سے کتراتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاروبار سے برکت ختم ہوجاتی ہے۔

سودے پر سودا کرنا ممنوع ہے

دو پارٹیوں کے درمیان معاملہ طے پاجانے کے بعد تیسرے فریق کو یہ اجازت نہیں کہ وہ کسی پارٹی کو ورغلا کر سودا خراب کرنے کی کوشش کرے۔ نہ تو خریدار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ سودا

---

[1] طبرانی اوسط: ج،ص 297.

[2] سنن ابی داؤد باب فی فضل الاقالة .

ختم کر دیں میں تمہیں یہی چیز اس سے کم قیمت پر مہیا کر دیتا ہوں اور نہ ہی فروخت کنندہ کو یہ پیشکش کی جا سکتی ہے کہ تم یہ چیز اسے نہ دو میں اس سے زیادہ میں خرید تا ہوں۔ یہ دونوں طریقے اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں کیونکہ اس طرح لوگوں کے درمیان نفرت و عدوات بھی پیدا ہوسکتی ہے اور قیمتیں بھی بڑھ سکتی ہیں کہ جب ایک شخص زیادہ قیمت لگائے گا تو ہوسکتا ہے کوئی تیسرا اور پھر چوتھا اس سے بھی زیادہ قیمت لگا دے، یوں محض ضد کی وجہ سے چیز مہنگی ہوسکتی ہے اس لیے حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں نبی ﷺ نے فرمایا:

'وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ'

''کوئی شخص کسی کے سودے پر سودا نہ کرے۔''[1]

دوسری حدیث میں ہے:

'لَا يَسُمِ الْمُسْلِمُ عَلَى سَوْمِ أَخِيهِ'

''مسلمان اپنے بھائی کی قیمت پر قیمت نہ لگائے۔''[2]

اگرچہ نیلامی (بولی) میں بھی ایک شخص دوسرے شخص کی طرف سے لگائی گئی قیمت پر قیمت لگاتا ہے مگر یہ جائز ہے۔

❁ ایک تو اس لیے کہ نیلام کا جواز خود نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

'أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بَاعَ حِلْسًا وَقَدَحًا وَقَالَ مَنْ يَشْتَرِي هَذَا الْحِلْسَ وَالْقَدَحَ فَقَالَ رَجُلٌ أَخَذْتُهُمَا بِدِرْهَمٍ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ يَزِيدُ عَلَى دِرْهَمٍ مَنْ يَزِيدُ عَلَى دِرْهَمٍ فَأَعْطَاهُ رَجُلٌ دِرْهَمَيْنِ فَبَاعَهُمَا مِنْهُ'

---

① صحيح مسلم، البر و الصلة، باب تحريم ظلم المسلم وخذله .

② صحيح مسلم تحريم بيع الرجل على بيع اخيه .

"رسول اللہ ﷺ نے ایک کمبل اور پیالہ فروخت کیا۔آپ نے فرمایا یہ کمبل اور پیالہ کو ن خریدے گا ایک شخص نے کہا میں یہ دونوں چیزیں ایک درہم میں لیتا ہوں نبی ﷺ نے فرمایا ایک درہم سے زائد کون دے گا ایک شخص نے دو درہم دیئے تو آپ نے یہ دونوں چیزیں اس کو بیچ دی۔"[1]

جلیل المرتبت محدث وفقیہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں اس کے حق میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

'بَابُ بَيْعِ الْمُزَايَدَةِ'

"نیلامی کے جواز میں"

- دوسرا اس لیے کہ قیمت پر قیمت لگانا تب ناجائز ہے جب فروخت کنندہ پہلے شخص کو فروخت کرنے پر آمادگی ظاہر کر چکا ہو،لیکن اگر اس نے ابھی تک اپنی آمادگی کا اظہار نہ کیا ہو صرف خواہشمندوں کو قیمت لگانے کی دعوت دے رہا ہو تو پھر یہ جائز ہے۔نیلامی میں چونکہ فروخت کنندہ کی دعوت پر قیمت لگائی جارہی ہوتی ہے لہذا یہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔

گناہ میں معاون نہ بنیں

ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت واستعداد کی حد تک بدی اور فحاشی کے انسداد کے لیے جدوجہد کرے،لہذا کسی مومن کے لیے یہ قطعا جائز نہیں کہ وہ مال ودولت کی خاطر برائی کے فروغ میں مدد ومعاون بنے۔قرآن مجید نے دنیا میں زندگی گزارنے کا ایک زریں اصول یہ بتایا ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا

---

[1] سنن ترمذی: کتاب البیوع،باب ماجاء فی بیع من یزید وقال ھذا حدیث حسن

اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾

''نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے رہو۔ گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کے معاون نہ بنو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک وہ سخت عذاب والا ہے۔''[1]

اس حکم کا اطلاق خرید وفروخت کے معاملات پر بھی ہوتا ہے لہذا اگر کسی فروخت کنندہ کو یہ یقین ہو کہ خریدار مجھ سے خریدی گئی چیز حرام مقصد کے لیے استعمال کرے گا تو اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہیں ہوگا۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'مَنْ حَبَسَ الْعِنَبَ أَيَّامَ الْقِطَافِ حَتّٰى يَبِيعَهُ مِمَّنْ يَتَّخِذُهُ خَمْرًا فَقَدْ تَقَحَّمَ النَّارَ عَلٰى بَصِيرَةٍ'

''جس نے انگور اتارنے کے زمانہ میں روکے رکھے تا کہ شراب ساز کو فروخت کرے وہ جانتے بوجھتے جہنم میں جا گھسا۔''[2]

صحیح بخاری میں مذکور ہے:

'وَ كَرِهَ عِمْرَانُ بْنُ حُصَيْنٍ بَيْعَهُ فِي الْفِتْنَةِ'

''عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے فتنہ (مسلمانوں کی باہمی لڑائی) کے دور میں اسلحہ کی فروخت کو مکروہ قرار دیا ہے۔''[3]

اس کی شرح میں علامہ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خریدار کے ساتھ تعاون ہے اور یہ تب منع ہے جب صورت حال واضح نہ ہو لیکن جب باغی کا علم ہو پھر برحق جماعت کو بیچنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

① المائدۃ :2.

② بلوغ المرام و حسّن ابن حجر اسنادہ .

③ باب بیع السلاح فی الفتنۃ و غیر ھا .

ابن بطال کہتے ہیں فتنہ کے زمانہ میں اسلحہ کی فروخت اس لیے ممنوع ہے کہ یہ گناہ پر تعاون کی ایک شکل ہے اسی لیے امام مالک، شافعی، احمد اور اسحاق نے شراب ساز کو انگور بیچنے مکروہ سمجھتے ہیں۔''[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس بارے میں شریعت کے دلائل اور قواعد واضح ہیں کہ معاملات میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے اور یہ کسی معاملے کے صحیح وفاسد اور حلال وحرام ہونے میں مؤثر ہوتے ہیں۔''[2]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

'کذلك السلاح يبيعه الرجل لمن يعرف انه يقتل به مسلما حرام باطل لما فيه من الإعانة على الإثم والعدوان'

''اسی طرح اس شخص کو اسلحہ فروخت کرنا بھی باطل اور حرام ہے جس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ اس کے ذریعے کسی مسلمان کو قتل کرے گا کیونکہ یہ ظلم وزیادتی میں تعاون ہے۔''

اس سے صاف واضح ہے کہ ڈاکوؤں اور معاشرہ میں بری شہرت رکھنے والے عناصر کو اسلحہ فروخت کرنا حرام ہے کیونکہ یہ معصیت ونافرمانی میں تعاون ہے۔ حرام کاروبار کے لیے جگہ فروخت کرنے کا بھی یہی حکم ہے بشرط کہ معاہدہ بیع کے وقت فروخت کنندہ کے علم میں ہو کہ خریدار اس کو حرام مقاصد کے لیے استعمال کرے گا لیکن اگر معاہدے کے وقت اس کی نیت معلوم نہ ہو اور بعد ازاں وہ اس کا غلط استعمال شروع کر دے تو اس صورت میں فروخت کنندہ پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھیں کہ شرعاً فروخت کنندہ پر مشتری سے خریداری کا

---

① فتح الباری ج 4 ص408.

② اعلام الموقعين متى يحمل الكلام على غير ظاهره .

مقصد معلوم کرنے کی پابندی نہیں ہے۔

ادھار معاملات لکھ لیا کریں

کاروباری طبقہ کو اکثر ادھار خرید و فروخت کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ بعض اوقات فریقین باہمی اعتماد اور خوشگوار تعلقات کی بنا پر ابتداء میں کسی تحریر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے مگر بعد میں بے اعتمادی اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور نوبت لڑائی، جھگڑے اور مقدمہ بازی تک جا پہنچتی ہے یا زیادہ عرصہ گزرنے کی وجہ سے مشتری کو یاد ہی نہیں رہتا کہ اس نے کوئی چیز خریدی تھی یا نہیں، اگر خریدی تھی تو کس قیمت پر۔

اس کے علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ مشتری اچانک فوت ہو جائے اور تحریری ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ورثاء ادائیگی سے انکار کر دیں۔ اس موقع پر اگر کسی فریق کے پاس تحریر موجود ہو تو یہ شہادت کا کام دے سکتی ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے یہ تلقین کی ہے کہ ادھار خرید و فروخت کی دستاویز لکھ لی جائے تاکہ بعد میں تنازعات اور اختلافات پیدا نہ ہوں اور اگر ہوں تو ان سے نمٹنا آسان ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾

''اے ایمان والو! جب تم مدت معین تک ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''[1]

اگرچہ اہل علم کی اصطلاح میں یہ حکم واجب نہیں لیکن اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ اس حکم کو معمولی سمجھ کر غفلت برتتے ہیں وہ بسا اوقات ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں جن سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ لہذا اگر قرآن کی اس گراں قدر تعلیم پر عمل کر لیا جائے تو بعد میں پیدا ہونے والے بہت سے مفاسد کا سد باب ہو سکتا ہے۔

چونکہ نقد لین دین میں اختلاف کا اندیشہ کم ہوتا ہے، اس لیے قرآن حکیم نے نقد خرید

---

[1] البقرة:282.

وفروخت کو ضبط تحریر میں لانے کی پابندی عائد نہیں فرمائی۔البتہ اگر فروخت شدہ چیز بڑی مالیت کی ہو تو پھر رسید کا اہتمام ضرور ہونا چاہیے تاکہ بعد میں کوئی نقص سامنے آئے تو مشتری کے پاس خریداری کا ثبوت موجود ہو جو فروخت کنندہ کو دیکھایا جا سکے جیسا کہ حضرت عداء بن خالد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک غلام یا لونڈی خریدی اور آپ نے ثبوت کے طور پر مجھے یہ تحریر لکھ کر دی:

'هَـذَا مَـا اشْتَرَى الْعَدَّاءُ بْنُ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ اشْتَرَى مِنْهُ عَبْدًا أَوْ أَمَةً لَا دَاءَ وَلَا غَائِلَةَ وَلَا خِبْثَةَ بَيْعَ الْمُسْلِمِ الْمُسْلِمَ'

''یہ وہ خریداری ہے جو عداء بن خالد بن ھوذہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔اس نے آپ سے ایک ایسا غلام یا لونڈی خریدی ہے جس میں نہ کوئی عیب ہے اور نہ ہی اخلاقی برائی اور دھوکہ دہی ہے،یہ ایک مسلمان کی مسلمان کے ساتھ بیع ہے۔''[1]

[1] سنن ترمذی ،باب ما جاء فی کتابة الشروط .سنن ابن ماجه ،باب شراء الرقيق.

فروخت کی جانے والی چیز کے متعلق ہدایات

جو چیز فروخت کی جارہی ہو اس کے متعلق بھی شریعت نے واضح اصول طے کر دیئے ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔

قرض دستاویزات کی تجارت جائز نہیں

شرعی قواعد وضوابط کے تحت قرض کے تمسُّکات اور کریڈٹ دستاویزات پر منافع کمانا جائز نہیں کیونکہ شریعت کی رو سے قرض تجارتی معاملہ نہیں ہے۔لہٰذا ڈیبنچرز، پاکستان انوسمنٹ بانڈز (پی آئی بی) فیڈرل انوسمنٹ بانڈز (ایف آئی بی) روایتی ٹرم فنانس سرٹیفکیٹس (ٹی ایف سی) اور ٹریژری بلز (ٹی بلز) کی خرید وفروخت ممنوع ہے کیونکہ یہ سب سودی قرض کے تمسُّکات ہیں۔بل آف ایکسچینج (Bill of Exchange) کی ڈسکاؤنٹ جس کا کاروباری حلقوں میں خاصا رواج ہے بھی کریڈٹ دستاویز بیچنے کی ایک شکل ہے۔ حالیہ مالیاتی بحران جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے کی ایک بڑی وجہ قرضوں اوران کے مُشتقّات (Derivatives) کی خرید وفروخت ہے۔اگر معاشی سرگرمیوں سے اس عنصر کو ختم کر دیں تو موجودہ بحران پر بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔

کریڈٹ دستاویزات کی بیع سے ملتی جلتی ایک صورت صُکُوک کی خرید وفروخت ہے جس کا تذکرہ کتب حدیث میں موجود ہے۔صُکُوک ''صَکّ'' کی جمع ہے جس کا معنی ہے ''دستاویز۔'' مروان بن حکم کے دور میں بیت المال سے راشن حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو کارڈز جاری کیے جاتے جنہیں صکوک کہا جاتا تھا۔بعض لوگ یہ کارڈز فروخت کر دیتے تھے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروان سے ملاقات کے لیے گئے تو ان سے کہا آپ نے تو سود کی بیع کو جائز قرار دے دیا ہے،

مروان نے کہا میں نے تو ایسا نہیں کیا، انہوں نے فرمایا آپ نے صکوک فروخت کرنے کی اجازت دی ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے غلے کی بیع سے منع فرمایا ہے تا آنکہ اسے قبضہ میں لے لیا جائے۔ چنانچہ مروان نے اپنے خطاب میں اس پر پابندی لگانے کا اعلان کر دیا۔ سلیمان بن یسار کہتے ہیں میں نے سیکورٹی اہلکاروں کو دیکھا وہ لوگوں کے ہاتھوں سے صکوک چھین رہے تھے۔[1]

چیز کا استعمال جائز ہو

دوسرا اصول یہ ہے کہ صرف انہی چیزوں کا لین دین ہو جن سے عام حالات میں شرعی طور پر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہو، جن چیزوں سے عام حالات میں فائدہ اٹھانا جائز نہیں ان کی خرید وفروخت بھی نہیں ہو سکتی۔ جیسے شراب، مردار اور خنزیر وغیرہ ہیں یہ چیزیں ہر حال میں حرام ہیں ان سے اضطراری حالت میں تو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کو کسی قسم کے حالات میں فروخت نہیں جا سکتا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبی ﷺ کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

'إِنَّ اللَّهَ إِذَا حَرَّمَ عَلَى قَوْمٍ أَكْلَ شَيْءٍ حَرَّمَ عَلَيْهِمْ ثَمَنَهُ '

''یقیناً اللہ تعالی جب کسی قوم پر کسی چیز کا کھانا حرام کرتے ہیں تو ان پر اس کی قیمت بھی حرام کر دیتے ہیں۔''[2]

وہ کونسی کونسی اشیاء ہیں جن کے استعمال کی شرعی طور پر اجازت نہیں اس سلسلے میں بعض قرآنی آیات ملاحظہ ہوں۔

﴿يَـاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

---

① صحيح مسلم: كتاب البيوع، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض.

② سنن ابی داؤد باب فی ثمن الخمر و الميتة.

''اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور فال نکالنے کے تیر ناپاک ہیں، شیطانی عمل ہیں لہٰذا ان سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''①

﴿قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ﴾

''کہہ دیجیے میری طرف جو وحی کی گئی ہے اس میں کسی کھانے والے پر میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو پس یقیناً وہ نجس ہے۔''②

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾

''بعض لوگ وہ ہیں جو دلفریب باتیں خریدتے ہیں تا بغیر علم کے اللہ کی راہ سے گمراہ کریں اور ان کو مذاق بناتے ہیں ان لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''③

قرآن مجید کی ان آیات میں شراب، جوے، بتوں، فال نکالنے کے تیروں، مردار، بہائے گئے خون، خنزیر کے گوشت اور دلفریب باتوں کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ شراب کے علاوہ دیگر منشیات اور مخدرات کا بھی یہی حکم ہے۔ اسی طرح بتوں کے علاوہ باقی آلات شرکیہ بھی اس حرمت میں داخل ہیں جبکہ دلفریب باتوں میں گانے، موسیقی ناول، فحش لٹریچر اور باطل نظریات پر مشتمل کتب سب شامل ہے۔ لہٰذا گانوں اور موسیقی پر مشتمل آڈیو، ویڈیو کیسٹس، سی ڈیز، فحاشی، جادو اور علم نجوم کی تعلیم پر مبنی کتب کی تجارت حرام ہے۔

نبی ﷺ نے کتے اور بلے کی قیمت سے بھی منع فرمایا ہے۔ ابو زبیر کہتے ہیں میں نے:

---

① المائدۃ: ۹۰.

② الانعام: 145.

③ لقمن: 6.

'سَأَلْتُ جَابِرًا عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَالسِّنَّوْرِ قَالَ زَجَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذَلِكَ'

''جابر رضی اللہ عنہ سے کتے اور بلّے کی قیمت کے بارہ میں پوچھا۔انہوں فرمایا نبی ﷺ نے اس سے ڈانٹا ہے۔''[1]

یہاں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ حرام اشیاء کا لین دین جس شکل میں بھی ہو وہ ناجائز ہی شمار ہو گا،جیسا کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

'إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيرِ وَالْأَصْنَامِ فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ شُحُومَ الْمَيْتَةِ فَإِنَّهُ يُطْلَى بِهَا السُّفُنُ وَيُدْهَنُ بِهَا الْجُلُودُ وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ فَقَالَ لَا هُوَ حَرَامٌ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عِنْدَ ذَلِكَ قَاتَلَ اللَّهُ الْيَهُودَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمَّا حَرَّمَ عَلَيْهِمْ شُحُومَهَا أَجْمَلُوهُ ثُمَّ بَاعُوهُ فَأَكَلُوا ثَمَنَهُ))

''بلا شبہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب،مردار،خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے۔عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ مردار کی چربی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے کیونکہ یہ کشتیوں کو لگائی جاتی ہے اور اس سے چمڑوں کو مالش کی جاتی ہے اور لوگ اس کو چراغوں میں جلاتے ہیں،تو آپ نے فرمایا نہیں یہ بھی حرام ہے۔پھر اس موقع پر آپ نے فرمایا اللہ یہودیوں کو تباہ کرے جب اللہ تعالی نے ان پر چربی حرام کی تو انہوں نے اس کو پگھلا کر بیچا اور اس کی قیمت کھا گئے۔''[2]

ابہام سے پاک ہو

تیسرا اصول یہ ہے کہ جس چیز کا سودا ہو رہا ہے وہ اپنی جنس،ذات،مقدار اور اوصاف کے

---

① صحیح مسلم باب تحریم ثمن الکلب .

② صحیح بخاری باب بیع المیتة والاصنام،صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر .

لحاظ سے بالکل واضح اور متعین ہو، کسی بھی اعتبار سے مبہم یا غیر واضح نہ ہو، اس قسم کے ابہام کو اصطلاح میں ''غرر'' (Uncertainty) کہتے ہیں جو شریعت کی نظر میں ممنوع ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

'نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ '

''رسول اللہ ﷺ نے کنکری کی بیع اور غرر پر مشتمل بیع سے منع فرمایا ہے۔''[1]

کنکری کی بیع خرید وفروخت کا وہ طریقہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔ فروخت کنندہ خریدار سے کہتا میں یہ کنکری پھینکتا ہوں یہ جہاں گرے گی میں وہاں تک یہ زمین آپ کو اتنے میں فروخت کرتا ہوں۔ یہ ممنوع ہے، کیونکہ اس صورت میں زمین مبہم رہتی ہے، جبکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو چیز فروخت کی جا رہی ہو وہ واضح اور متعین ہونی چاہیے۔ یہ بھی اصل میں غرر ہی ہے مگر چونکہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اس میں ملوث تھے اس لیے اس کا علیحدہ تذکرہ فرمایا۔ اس نوعیت کی اور بھی کئی بیوع رائج تھیں مگر آپ ﷺ نے سب پر پابندی عائد فرما دی۔

ہمارے معاشرے میں ہاؤسنگ اسکیموں کی فائلیں فروخت کرنے کا رواج ہے حالانکہ ابھی وہاں نہ تو پلاٹنگ ہوئی ہوتی ہے اور نہ ہی افراد کا الگ الگ حصہ متعین ہوتا ہے۔ شرعی اعتبار سے فائلز کی خرید وفروخت جائز نہیں کیونکہ جب تک اسکیم کی پلاٹنگ نہ کر دی جائے پلاٹ مبہم رہتا ہے جس کی نشاندہی ممکن نہیں ہوتی اور مبہم چیز کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔ اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے پلاٹنگ کی جائے اس کے بعد خرید وفروخت شروع ہو۔

زمین میں پوشیدہ سبزیوں کی بیع

بعض اوقات کاشت کار شلجم، گاجر، مولی، اروی، لہسن اور پیاز وغیرہ کی فصل کو زمین کے اندر ہی فروخت کر دیتے ہیں، چونکہ یہ سبزیاں زمین میں پوشیدہ ہوتیں ہیں اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا

[1] صحيح مسلم باب بطلان بيع الحصاة .

ہے کہ ایسا کرنا درست ہے یا یہ غرر کے زمرہ میں داخل ہے؟ جلیل القدر فقیہ امام ابن قیم رحمہ اللہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

'ولیس من بیع الغرر بیع المغیبات فی الأرض کاللفت والجزر والفجل والقلقاس والبصل ونحوها فإنها معلومة بالعادة یعرفها أهل الخبرة بها وظاهرها عنوان باطنها فهو کظاهر الصبرة مع باطنها ولو قدر أن فی ذلك غررا فهو غرر یسیر یغتفر فی جنب المصلحة العامة التی لا بد للناس منها'

''جو سبزیاں زمین میں پوشیدہ ہوتیں ہیں جیسے شلجم، گاجریں، مولیاں، اروی اور پیاز وغیرہ ہیں ان کی (زمین کے اندر) بیع غرر میں داخل نہیں ہے کیونکہ یہ عام طور پر معلوم ہوتیں ہیں ان کے بارے میں معلومات رکھنے والے ان کو جانتے ہوتے ہیں۔ ان کی ظاہری حالت سے ان کی اندرونی حالت کا علم ہو جاتا ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے غلے کے اوپر والے حصے کو دیکھ کر اس کی اندرونی حالت کا پتا چل جاتا ہے اگر اس میں غرر تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ معمولی ہوگا جو مفاد عامہ جو کہ لوگوں کے لیے ناگزیر ہے کی وجہ سے نا قابل گرفت ہے۔''[1]

آں رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''اگر ان کو ایک ہی مرتبہ نکال کر بیچنے کی شرط عائد کر دی جاتی تو اس میں مشقت ہوتی اور لوگوں کے اموال خراب ہوتے جبکہ شریعت کا یہ تقاضا نہیں ہے۔ اور اگر یہ پابندی لگا دی جاتی کہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں بیچی جائے یعنی جتنی نکالی جائے اتنی ہی فروخت کی جائے تو اس میں بھی تنگی اور حرج ہوتا، اس سے اصحاب مال اور مشتری کے

---

[1] زاد المعاد ج 5 ص820.

مفادات کا معطل ہونا کسی سے مخفی نہیں ہے۔''[1]

باغات کی خرید وفروخت

عہد رسالت میں مدینہ منورہ سمیت عرب کے پیداواری علاقوں میں آج کل کی طرح یہی رواج تھا کہ لوگ اپنے باغات کا پھل درختوں سے اتار کر بیچنے کی بجائے درختوں کی شاخوں پر لگا ہوا ہی فروخت کر دیتے تھے اور بعض اوقات پھلوں میں صلاحیت پیدا ہونے سے قبل بلکہ پھل کے ظہور سے بھی قبل بیع کر لیتے تھے لیکن جناب رسالت مآب ﷺ نے یہ ہدایت فرمائی کہ جب تک پھل میں صلاحیت ظاہر نہ ہو اس کی خرید وفروخت درست نہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں منقول ہے:

'أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتَّى يَبْدُوَ صَلاَحُهَا ، نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُبْتَاعَ '

''رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کی صلاحیت ظاہر ہونے سے قبل ان کی بیع سے منع فرمایا۔ آپ نے یہ پابندی فروخت کنندہ اور خریدار دونوں پر عائد کی۔''[2]

صلاحیت ظاہر ہونے کی شرط کب پوری ہوتی ہے اس بارے میں روایات مختلف ہیں صحیح بات یہ ہے کہ جب پھل ایسی حالت میں آجائے جس میں اسے کسی استعمال میں لایا جا سکتا ہو تو اس پر صلاحیت ظاہر ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے اور اس کی خرید وفروخت بھی ہو سکتی ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

'وَيُؤْكَلُ مِنْهَا'

''اور وہ کھانے کے قابل ہو جائے۔''

اس سے پہلے کیوں منع ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

① ایضاً ص:821۔

② صحیح بخاری : کتاب البیوع ،باب بَيْعِ الثِّمَارِ قَبْلَ أَنْ يَبْدُوَ صَلاَحُهَا

'أَرَأَيْتَ إِذَا مَنَعَ اللّٰهُ الثَّمَرَةَ بِمَ يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ مَالَ أَخِيهِ'

''بتاؤ تو سہی! اگر اللہ تعالی نے پھل سے محروم کر دیا تو تم میں سے کوئی کس چیز کے عوض اپنے بھائی کا مال لے گا۔''[1]

یعنی اگر آندھی یا کسی دوسری قدرتی آفت جس میں کسی انسان کا عمل دخل نہیں ہوتا کی وجہ سے پھل ضائع ہو گیا تو مشتری کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔گویا فروخت کنندہ نے اپنے بھائی کا مال ناحق لیا جو کہ حرام ہے۔

چونکہ اس روایت سے ضمناً یہ مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کسی نے صلاحیت پیدا ہونے سے قبل درخت پر لگا پھل فروخت کر دیا اور پھر کسی آسمانی آفت سے پھل اس قدر ضائع ہو گیا کہ خریدار کو کچھ بھی حاصل نہ ہوا تو بیچنے والے کو خریدار کی رقم واپس کرنا ہوگی اس لئے محدث کبیر حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ پھلوں میں صلاحیت پیدا ہونے سے پہلے ان کی خرید وفروخت ہو سکتی ہے تاہم آفت زدگی کی صورت میں نقصان باغ کے مالک کا ہوگا۔چنانچہ انہوں نے صحیح بخاری میں اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان باندھا ہے:

'إِذَا بَاعَ الثِّمَارَ قَبْلَ أَنْ يَبْدُوَ صَلَاحُهَا ثُمَّ أَصَابَتْهُ عَاهَةٌ فَهُوَ مِنَ الْبَائِعِ'

''جب کوئی صلاحیت پیدا ہونے سے قبل پھلوں کو فروخت کر دے تو آفت آنے پر نقصان کا ذمہ دار فروخت کنندہ ہوگا۔''

شارح بخاری علامہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس عنوان میں امام بخاری کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر چہ پھل کی صلاحیت ظاہر نہ ہوئی ہو پھر بھی اس کی بیع صحیح ہے تاہم انہوں نے صلاحیت سے قبل بیع کی صورت میں

---

[1] صحیح بخاری : کتاب البیوع ،باب إِذَا بَاعَ الثِّمَارَ قَبْلَ أَنْ يَبْدُوَ صَلَاحُهَا ثُمَّ أَصَابَتْهُ عَاهَةٌ فَهُوَ مِنَ الْبَائِعِ .

نقصان کا ذمہ دار فروخت کنندہ کو ٹھہرایا ہے۔"[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے موقف کی تائید میں امام زہری کا یہ قول بھی پیش کیا ہے:

'لَوْ أَنَّ رَجُلًا ابْتَاعَ ثَمَرًا قَبْلَ أَنْ يَبْدُوَ صَلَاحُهُ ، ثُمَّ أَصَابَتْهُ عَاهَةٌ ، كَانَ مَا أَصَابَهُ عَلَى رَبِّهِ'

"اگر کوئی شخص صلاحیت پیدا ہونے سے قبل پھل فروخت کر دے پھر اس پر کوئی آفت آ جائے تو نقصان باغ کے مالک کے ذمے ہوگا۔"

بظاہر حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف ہی سہل اور معقول معلوم ہوتا ہے اور یہ باغات کی خرید وفروخت کے عصری تقاضے پورے کرتا ہے، اس کے مقابلے میں دیگر نقطۂ ہائے نظر لوگوں کے لئے مشکلات کا باعث ثابت ہو سکتے ہیں۔ البتہ باغات کی خرید وفروخت کی وہ صورت ضرور ممنوع ہوگی جس میں باغ کو دو یا تین سال کے لئے ٹھیکے پر دے دیا جاتا ہے جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

'نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ بَيْعِ السِّنِينَ'

"کہ نبی ﷺ نے (باغات کو) کئی سال کے لئے بیچنے سے منع فرمایا ہے۔"[2]

کیونکہ اس صورت میں جب بیع ہوتی ہے تو پھل کا نام ونشان بھی نہیں ہوتا حالانکہ جب تک کوئی چیز وجود میں نہ آ جائے شریعت کی رو سے اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ اسے بیع سلم پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ متعین باغ کی پیداوار میں سلم جائز نہیں۔

سپردگی ممکن ہو

فروخت کی جانے والی چیز کے متعلق چوتھا حکم یہ ہے کہ فروخت کنندہ اس کو خریدار کے

---

① فتح الباری: ج4، ص503.

② صحیح مسلم باب کراء الارض.

حوالے کرسکتا ہو، جو چیز خریدار کے سپرد نہ کی جا سکتی ہو اس کو بیچنا جائز نہیں کیونکہ مشتری سے قیمت وصول پانے کے بعد چیز اس کے حوالے نہ کرنا صریح زیادتی ہے۔لہذا فضا میں موجود پرندے اور رسی تڑا کر بھاگے ہوئے جانور کو فروخت کرنا صحیح نہیں تا آنکہ مالک ان پر قابو نہ پالے کیونکہ اس حالت میں حوالگی ممکن نہیں۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بھاگے ہوئے غلام کی بیع صحیح نہیں، خواہ اس کے مقام کے بارے میں علم ہو یا نہ ہو اور اسی طرح بھاگے ہوئے اونٹ اور گھوڑے وغیرہ کی بیع بھی درست نہیں۔امام مالک، شافعی، ابوثور، ابن منذر اور احناف کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔''

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک تو یہ بیع غرر ہے اور دوسرا یہاں سپردگی ممکن نہیں لہذا یہ جائز نہیں۔''[1]

ایسے ہی اس پلاٹ اور مکان کو بھی بیچنا درست نہیں جس پر کسی نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہو یہاں تک کہ اسے ناجائز قابض سے واگزار کرالیا جائے کیونکہ ان صورت میں سپردگی ممکن نہیں ہے۔ہاں اگر غصب شدہ پلاٹ یا مکان غاصب کو ہی فروخت کیا جائے یا کسی ایسے شخص کو جو غاصب سے قبضہ لینے کی طاقت رکھتا ہو تو ایسی صورت بیع جائز ہوگی تاہم قبضہ نہ ملنے کی صورت میں خریدار کو بیع منسوخ کرنے کا اختیار ہوگا، چنانچہ مشہور حنبلی فقیہ علامہ بہوتی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'فإن باعه من غاصبه أو قادر على أخذه صح لعدم الغرر فإن عجز بعد فله الفسخ'

''اگر غصب شدہ چیز غاصب کو یا ایسے شخص کو بیچے جو قبضہ لے سکتا ہو تو یہ بیع صحیح ہوگی کیونکہ اب غرر نہیں رہا، اور اگر بعد میں قبضہ نہ لے سکا تو اس کو منسوخ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔''[2]

---

[1] المغنی ج 6، ص 289.

[2] الروض المربع ۲۷۹.

قیمت کے متعلق ہدایات

یہ بات تو مسلم ہے کہ بیع اسی صورت ہوگی جب مشتری فروخت کنندہ کو بدلے میں کوئی قیمت ادا کرے گا، اس کے بغیر بیع وجود میں نہیں آسکتی تاہم شریعت مُطَہَّرہ نے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسکے متعلق بھی ہماری مکمل رہنمائی کی ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ یاد رکھیں کہ معاوضہ کرنسی کی شکل میں ہونا ضروری نہیں بلکہ ہر اس چیز کی بنیاد پر لین دین ہوسکتا ہے جو شریعت کی رو سے جائز اور معاشرہ میں بطور معاوضہ قبول کی جاتی ہو۔ جو چیزیں شرعاً جائز نہ ہوں جیسے شراب، مردار اور خنزیر وغیرہ ہے، یا وہ اشیاء جو معاشرہ میں آلہ مبادلہ کی حیثیت سے رائج نہ ہوں، وہ قیمت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔

قیمت معلوم ہو

قیمت کے بارہ میں دوسری ہدایت یہ دی گئی ہے کہ فریقین مکمل تفصیلات طے کر کے معاملہ کریں، مثلاً قیمت کیا ہوگی، ادائیگی فوری ہوگی یا تاخیر سے، اگر تاخیر سے ہوگی تو کتنی مدت بعد، اور ادائیگی کا طریقہ کیا ہوگا، یکمشت ہوگی یا قسطوں میں، یہ تمام امور پہلے طے کرنا ضروری ہیں بصورت دیگر بیع منعقد نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے فقہائے کرام بیع کی شرائط میں ایک شرط یہ بیان کرتے ہیں۔

'أن یکون الثمن معلوما للمتعاقدین أیضا کما تقدم لأنه أحد العوضین فاشترط العلم به كالمبيع'

''فریقین کو قیمت بھی معلوم ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کیونکہ ایک عوض یہ قیمت ہے لہذا فروخت کی جانے والی چیز کی طرح اس کا بھی علم ہونا چاہیے۔''[1]

[1] الروض المربع ص: 280، 281.

قیمت مجہول ہونے کی ایک شکل یہ ہے کہ چیز خریدتے وقت قیمت کا تذکرہ ہی نہ ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ تذکرہ تو ہو مگر اس طرح کہ فریقین میں سے کسی کو متعین قیمت کا علم نہ ہو۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ میں فلاں چیز کو اس کی بازاری قیمت پر خریدتا ہوں یا اس قیمت پر خریدتا ہوں جو اس پر درج ہے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی بازاری قیمت یا اس پر درج شدہ قیمت کیا ہے۔ چنانچہ علامہ بہوتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'فإن باعه برقمه أى ثمنه المكتوب عليه وهما يجهلانه أو أحدهما لم يصح للجهالة'

''اگر اس کو اوپر لکھی ہوئی قیمت پر بیچے جبکہ وہ دونوں یا ان میں سے ایک بھی لکھی ہوئی قیمت سے ناواقف ہو تو قیمت مجہول ہونے کی بنا پر بیع صحیح نہیں ہوگی۔''[1]

اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جس قیمت پر فلاں شخص نے فروخت کی ہے یا جس قیمت پر لوگ فروخت کر رہے ہیں اسی قیمت پر میں آپ کو بیچتا ہوں جبکہ فریقین یا خریدار اس قیمت سے واقف نہ ہو یا یہ کہنا کہ جو قیمت آپ کو پسند ہو وہ دے دینا یا جس قیمت پر میں نے خریدی ہے اسی پر آپ کو بیچتا ہوں اور خریدار کو اس کی قیمت خرید کا علم نہ ہو، کیونکہ ان صورتوں میں قیمت مجہول رہتی ہے جو نزاع کا باعث بن سکتی ہے جبکہ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ قیمت پہلے طے ہونی چاہیے تا کہ جھگڑے کا خطرہ نہ رہے، تاہم اگر مذکورہ صورتوں میں مجلس عقد کی برخاستگی سے قبل حتمی قیمت کا علم ہو جائے تو پھر بیع جائز ہوگی۔

ہاں اگر کسی ایسی چیز کی بیع ہو رہی ہے جس کی مختلف اکائیوں اور ان کی بازاری قیمت میں فرق نہ پایا جاتا ہو تو ایسی صورت میں بازاری قیمت پر خرید وفروخت درست ہوگی کیونکہ اس صورت میں نزاع کا احتمال نہیں رہتا۔ جن فقہاء نے بازاری قیمت کو معیار بنا کر خرید وفروخت کرنے کو جائز قرار دیا ہے ان کی مراد بھی یہی ہے۔

---

[1] الروض المربع ص 281۔

نقد اور ادھار قیمت میں فرق

یہ امر تو طے ہے کہ خرید وفروخت جس طرح نقد جائز ہے ادھار بھی جائز ہے بشرطیکہ ادائیگی کی مدت معلوم ہو لیکن کیا ادھار کی صورت میں نقد کے مقابلہ میں زائد قیمت رکھنا جائز ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو قیمت پر گفتگو کرتے ہوئے پوری شدّت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے کیونکہ عصر حاضر میں قسطوں پر لین دین کا رواج ہے اور اس میں ہمیشہ نقد کی نسبت زیادہ قیمت رکھی جاتی ہے۔ بعض علماء اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں لیکن اگر دلائل کی روشنی میں غور کیا جائے تو ان کی رائے صائب معلوم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے بیشتر فقہاء محدثین ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ جائز سمجھتے ہیں، چنانچہ امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'قَالَتِ الشَّافِعِيَّةُ وَالْحَنَفِيَّةُ وَزَيْدُ بْنُ عَلِيٍّ وَالْمُؤَيَّدُ بِاللَّهِ وَالْجُمْهُورُ إِنَّهُ يَجُوزُ لِعُمُومِ الْأَدِلَّةِ الْقَاضِيَةِ بِجَوَازِهِ وَهُوَ الظَّاهِرُ'

''شافعیہ، حنفیہ، زید بن علی، مؤید باللہ اور جمہور نے جواز کے عمومی دلائل کی بنا پر اسے جائز قرار دیا ہے اور ظاہر بھی یہی ہے۔''[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس کے حق میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس کا نام ہے۔

'شِفَاءُ الْغَلِيلِ فِي حُكْمِ زِيَادَةِ الثَّمَنِ لِمُجَرَّدِ الْأَجَلِ'

اس رسالہ میں انہوں نے زیر بحث مسئلہ کے متعلق بڑی عمدہ تحقیق پیش فرمائی ہے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

''ہم نے اس میں ایسی تحقیق پیش کی ہے جو ہم سے پہلے کسی نے نہیں کی۔''[2]

اہلحدیث اکابر علماء سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی، نواب صدیق حسن خان، مولانا ثناء اللہ

---

① نیل الاوطار: ج8، ص 201.

② ایضاً ص:202۔

امرتسری اور حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ کا موقف بھی یہی ہے کہ ادھار میں زائد قیمت رکھی جاسکتی ہے۔[1]

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم کی آیت: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ﴾ ''اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے'' سے پتہ چلتا ہے کہ سوائے ان شکلوں کے جن کی حرمت قرآن وحدیث میں بیان کردی گئی ہے خرید وفروخت کی تمام صورتیں جائز ہیں، چونکہ قرآن کی کسی آیت یا حدیث نبوی سے یہ واضح نہیں کہ ادھار میں زائد قیمت لینا غلط ہے اس لیے یہ جائز ہے۔

جن علماء کے نزدیک نقد اور ادھار کی صورت میں علیحدہ علیحدہ قیمت رکھنا ناجائز ہے وہ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں۔

'عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ '

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع میں دو بیع سے منع فرمایا ہے۔''[2]

'قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ فَلَهُ أَوْكَسُهُمَا أَوِ الرِّبَا '

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ایک بیع میں دو بیع کرے اس کے لیے کم قیمت ہے یا سود۔''[3]

ان حضرات کے خیال میں ''ایک بیع میں دو بیع'' کا مطلب نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق ہے لیکن اگر اس کی تشریح میں محدثین کے اقوال کو سامنے رکھا جائے تو یہ مفہوم درست معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

'وَقَدْ فَسَّرَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ قَالُوا بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍأَنْ يَقُولَ أَبِيعُكَ هَذَا

---

[1] فتاوی نذیریہ : ج ،ص162۔ الروضة الندية ج2،ص89۔ فتاوی ثنائیہ: ج،ص365۔ فتاوی اهل حدیث : ج ،ص263، 264۔

[2] ترمذی : کتاب البیوع باب ما جاء فی النھی عن بیعتین فی بیعة۔

[3] سنن ابی داؤد: باب فیمن باع بیعتین فی بیعة ۔

الثَّوبَ بِنَقدٍ بِعَشَرَةٍ وَبِنَسِيئَةٍ بِعِشرِينَ وَلَا يُفَارِقُهُ عَلَى أَحَدِ البَيعَينِ فَإِذَا فَارَقَهُ عَلَى أَحَدِهِمَا فَلَا بَأسَ إِذَا كَانَتِ العُقدَةُ عَلَى وَاحِدٍ مِنهُمَا .

قَالَ الشَّافِعِيُّ وَمِن مَعنَى نَهيِ النَّبِيِّ ﷺ عَن بَيعَتَينِ فِي بَيعَةٍ أَن يَقُولَ أَبِيعُكَ دَارِي هَذِهِ بِكَذَا عَلَى أَن تَبِيعَنِي غُلَامَكَ بِكَذَا،

''بعض اہل علم نے ''ایک بیع میں دو بیع'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ فروخت کنندہ یوں کہے کہ میں یہ کپڑا تجھے نقد دس اور ادھار بیس کا فروخت کرتا ہوں، اور فریقین کوئی ایک قیمت طے کئے بغیر جدا ہو جائیں، لیکن جب ایک قیمت پر متفق ہو کر جدا ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے فروخت کنندہ یہ کہے کہ میں اپنا یہ گھر آپ کو اتنے میں اس شرط پر بیچتا ہوں کہ آپ اپنا غلام اتنے میں مجھے فروخت کرینگے۔''[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہمارے استاد (ابن تیمیہ رحمہ اللہ) کا قول ہے کہ ''جو ایک بیع میں دو بیع کرے اس کے لیے کم قیمت ہے یا سود'' سے مراد بعینہ بیع عینہ ہے۔''[2]

بیع عینہ یہ ہے کہ کوئی چیز ادھار زائد قیمت پر بیچ کر دوبارہ نقد کم قیمت پر خرید لی جائے۔ مثلاً ایک شخص نے ایک سو دس روپے میں کتاب خریدی اور ادائیگی ایک ماہ بعد طے پائی، اب فروخت کنندہ اسی شخص سے یہی کتاب ایک سو روپے میں نقد دوبارہ خرید لیتا ہے تو یہ بیع عینہ ہے جو سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے حرام ہے کیونکہ فروخت کنندہ نے دیا تو ایک سو روپیہ ہے مگر وصول ایک سو دس پانے ہیں یہی سود ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

---

① سنن ترمذی باب ما جاء في النهي عن بيعتين في بيعة .

② تهذيب : ج5، ص100 .

علماء نے اس کے دو مفہوم بیان کئے ہیں:

1. فروخت کنندہ یہ کہے کہ میں آپ کو نقد دس کی یا ادھار بیس کی بیچتا ہوں۔ یہ مفہوم امام احمد رحمہ اللہ نے سماک رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع فرمایا کی تشریح سماک رحمہ اللہ نے یوں کی ہے کہ فروخت کنندہ یہ کہے کہ ادھار اتنے کی اور نقد اتنے کی۔ مگر یہ تشریح کمزور ہے کیونکہ اس صورت میں نہ تو سود شامل ہے اور نہ ہی دو سودے ہوئے ہیں، صرف دو قیمتوں میں سے ایک قیمت کے ساتھ سودا طے پایا ہے۔

2. اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ فروخت کنندہ یوں کہے کہ میں آپ کو یہ چیز ایک سال کی مدت کے لیے ایک سو کے بدلے اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ میں آپ سے اسّی کی نقد خرید لوں گا، حدیث کا اس کے علاوہ دوسرا کوئی معنی نہیں ہے۔''[1]

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نقد اور ادھار خریداری میں قیمت کا فرق بالکل جائز ہے۔ جن حضرات نے ادھار فروخت میں زائد قیمت لینے کو سود قرار دیا ہے ان کا موقف صحیح نہیں ہے۔ مزید تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''دور حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم'' ملاحظہ فرمایئے۔

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ ادھار خریداری میں ایک مرتبہ جو قیمت طے ہو جائے ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تاخیر کے نتیجے جو اضافہ بھی ہوگا وہ درحقیقت ادھار میں اضافہ ہوگا اور ادھار میں اضافی رقم لینا سود ہے۔

ادائیگی بروقت کی جائے

ادھار میں بیع مکمل ہوتے ہی قیمت مشتری کے ذمے دَین (Debt) ہو جاتی ہے لہٰذا

[1] تهذيب : ج5، ص105، 106.

مشتری کا فرض ہے کہ وہ طے شدہ مدت کے اندر ادائیگی یقینی بنائے، لیت ولعل یا پس وپیش نہ کرے۔ نبی اکرم ﷺ نے قرض کی ادائیگی پر قادر مقروض کی طرف سے ٹال مٹول کو ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

'لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عُقُوبَتَهُ وَعِرْضَهُ'

''ادائیگی پر قادر شخص کا ٹال مٹول کرنا اس کی سزا اور عزت کو حلال کر دیتا ہے۔''①

سزا سے مراد قید اور عزت حلال کرنے کا مطلب اس کی سرزنش کرنا ہے یعنی ادائیگی پر قادر شخص اگر اپنے ذمے واجب قرض کی ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے تو وہ قید اور مذمت کا مستحق ہے۔ تاہم فروخت کنندہ کو بھی چاہیے کہ وہ طے شدہ مدت سے قبل ادائیگی کا مطالبہ نہ کرے۔ اور اگر خریدار تنگدستی کی وجہ سے تاخیر کر رہا ہو تو قرآنی حکم کے مطابق اس کو فراخدستی تک مہلت دی جائے اور اگر کسی وجہ سے بروقت ادائیگی نہ کر سکے تو جرمانہ وصول نہ کیا جائے کیونکہ یہ سود کے زمرہ میں آتا ہے۔ ہاں البتہ اگر مدیون (Debtor) ادائیگی کے وقت اپنی مرضی سے ازراہ احسان کچھ زائد ادا کرنا چاہے تو وہ بلاشبہ کر سکتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

'إِنَّ خِيَارَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً'

''بے شک تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو ادائیگی کرنے میں اچھے ہوں۔''②

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

'كَانَ لِي عَلَى النَّبِيِّ ﷺ دَيْنٌ فَقَضَانِي وَزَادَنِي'

''میں نے نبی ﷺ سے قرض لینا تھا تو آپ نے مجھے ادائیگی کی اور زائد دیا۔''③

لیکن ادھار دہندہ خود زائد طلب نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے بطور نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا

---

① صحيح البخاري باب لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالٌ.

② صحيح البخاري باب حسن القضاء.

③ صحيح مسلم باب استحباب تحية المسجد .

ہے کیونکہ اس صورت میں یہ طے شدہ اضافہ ہی شمار ہوگا۔

منافع کی حدود

شریعت میں نفع کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی کہ جس سے زائد نفع لینا جائز نہ ہو،اس لئے کہ مارکیٹ میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔بعض اوقات خریداری کے وقت قیمتیں انتہائی نچلی سطح پر آئی ہوتی ہیں اور پھر ان میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے تاجروں کو سو فیصد نفع حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی صورت حال اس کے برعکس بھی ہوسکتی ہے کہ خریداری کے وقت تو قیمتیں انتہائی اوپر کی سطح پر ہوں اور بعد میں اچانک گر جائیں جس سے تاجروں کو نقصان اٹھانا پڑے۔لہذا یہ شریعت مُطَہّرہ کا کمال ہے کہ اس نے نفع کی کوئی شرح متعین نہیں فرمائی بلکہ اسے آزاد چھوڑ دیا ہے تا کہ لوگ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنا مال فروخت کریں جس سے قیمتیں خود ہی مناسب سطح پر آجائے گیں۔اس کی دلیل کہ بعض حالات میں سو فیصد نفع بھی لیا جا سکتا ہے یہ روایت ہے:

"حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قربانی یا بکری کریدنے کے لئے ان کو ایک دینار دیا تو انہوں نے دو بکریاں خرید لیں اور پھر ایک بکری ایک دینا میں بیچ دی۔ایک دینار اور ایک بکری لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے،آپ نے ان کے لئے خرید وفروخت میں برکت کی دعا فرمائی۔اس کے بعد اگر وہ مٹی بھی خریدتے تو اس میں بھی نفع ہوتا۔"[1]

لیکن اگر کوئی سامان اور اس کی مارکیٹنگ صرف کسی ایک شخص کے پاس ہو تو پھر اس کے لئے مارکیٹ سے زائد نفع لینا جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے مشابہہ ہوگا کیونکہ جب لوگوں کو اس چیز کی حاجت ہوگی تو وہ اسی سے خریدنے پر مجبور ہوں گے خواہ اس کی قیمت کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

---

(1) صحیح بخاری۔سنن ابی داؤد،باب المضارب یخالف.

مارکیٹ ریٹ خراب نہ کریں

بلاشبہ انسان اپنی چیز جس قیمت پر چاہے فروخت کرسکتا ہے شریعت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن جس طرح استحصال اور ظالمانہ منافع خوری ممنوع ہے اسی طرح نامناسب حد تک قیمتیں کم کرکے مارکیٹ کا توازن خراب کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے، چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی شہرہ آفاق تالیف مؤطا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے:

'أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ مَرَّ بِحَاطِبِ بْنِ أَبِي بَلْتَعَةَ وَهُوَ يَبِيعُ زَبِيبًا لَهُ بِالسُّوقِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِمَّا أَنْ تَزِيدَ فِي السِّعْرِ وَإِمَّا أَنْ تُرْفَعَ مِنْ سُوقِنَا'

''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے اور وہ بازار میں اپنا منقی بیچ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا یا تو قیمت میں اضافہ کردیا ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ۔''[1]

مارکیٹ ریٹ سے بہت کم قیمت رکھنا بھی دراصل اجارہ داری قائم کرنے اور دوسرے تاجروں کا راستہ روکنے کا ایک حربہ ہے بالخصوص چھوٹے تاجر اس سے بہت زیادہ متأثر ہوتے ہیں اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاطب بن ابی بلتعہ کو انتہائی کم نرخ پر بیچنے سے منع فرمادیا۔

جو حضرات قیمتوں میں عدم مداخلت کے قائل ہیں وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف سے رجوع کرلیا تھا جیسا کہ سنن بیہقی میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازار سے واپس آئے تو اپنا محاسبہ کیا اور حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا یہ میرا فیصلہ نہیں ہے میرا مقصد تو شہر والوں کی بھلائی تھا ورنہ آپ جہاں چاہیں اور جیسے چاہیں بیچیں۔[2]

---

① مؤطا.

② سنن بیهقی ج 6، ص 29.

لیکن یہ روایت ثابت نہیں کیونکہ اس کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت قاسم بن محمد بیان کرتے ہیں جن کی جناب عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملاقات ثابت نہیں ہے۔ ①

باقی جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مدینہ منورہ میں قیمتوں میں اضافہ ہوا اور لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ نرخ مقرر فرما دیجئے! تو آپ نے اس سے انکار کرتے ہوئے فرمایا:

'إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ'

''بے شک اللہ تعالی ہی نرخ مقرر کرنے والا ہے جو تنگی، کشادگی کرنے والا اور رزق عطا فرمانے والا ہے۔'' ②

تو یہ اس تناظر میں فرمایا جب قیمتوں میں اضافہ کے عوامل فطری ہوں۔ اس میں تاجروں کی گراں فروشی کا عمل دخل نہ ہو مثلاً کسی چیز کی قلت ہو گئی ہو یا اس کا کوئی اور ایسا سبب ہو جو معاشی حالات پر اثر انداز ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں قیمتیں مقرر کرنا درست نہیں۔ لیکن اگر تاجر صارفین کے ساتھ ظلم وزیادتی کر رہے ہوں تو پھر حکومتی مداخلت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں عوام کو تاجروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ چنانچہ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر لوگوں کا مفاد نرخ مقرر کئے بغیر حاصل نہ ہوتا ہو تو عدل وانصاف پر مبنی نرخنامہ جاری کیا جا سکتا ہے جس میں نہ کسی پر ظلم ہو اور نہ حق کسی کی تلفی ہو۔ لیکن جب لوگوں کا مفاد اس کے بغیر ہی پورا ہو رہا ہو تو پھر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔'' ③

---

① السنن الکبری : ج ص383، فتح الباری : ج9، ص478.

② سنن ابی داؤد : باب فی التسعیر۔ سنن الترمذی : باب ما جاء فی التسعیر

③ الطرق الحکمیة ص 244.

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تاجروں کی ظالمانہ منافع اندوزی کو کنٹرول کرنا جائز ہے کیونکہ یہ فساد فی الارض ہے۔[1]

[1] حجۃ اللہ البالغۃ: ج2، ص199.

بیع میں خیار(Option) کی صورتیں

بعض اوقات انسان غور وفکر کے بغیر بیع کر لیتا ہے مگر اسے جلد ہی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، یا اسے کسی ماہر سے مشورہ کرنے اور چیز کی جانچ پڑتال کے لیے وقت درکار ہوتا ہے، یا بیع کی شرائط پوری نہ ہونے، یا چیز اور قیمت کے متعلق مکمل معلومات نہ ہونے، یا دھوکے اور فراڈ کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے، اسلامی شریعت نے اس کا حل قانون خیار کی شکل میں متعارف کرایا ہے۔ خیار کا معنی ہے

"خرید وفروخت کے معاملہ کو فسخ قرار دینے یا اسے برقرار رکھنے میں سے جو صورت بہتر معلوم ہو اس کا انتخاب کرنا۔"

خیار کی بہت سی اقسام ہیں مگر ان میں سے نمایاں قسمیں آٹھ ہیں جو درج ذیل ہیں۔

خیار مجلس

اس کا مطلب ہے جب تک فریقین اس مقام پر موجود ہیں جہاں بیع ہوئی ہے ان میں سے ہر ایک کو بیع ختم کرنے کا اختیار حاصل ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

'اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَفْتَرِقَا'

"بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں۔"[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"شارع علیہ السلام نے بیع میں خیار مجلس فریقین کے فائدے اور مکمل رضا مندی جو اللہ تعالی نے بیع کے لیے ایک شرط کے طور پر بیان کی ہے کے لیے رکھا ہے کیونکہ عموماً بیع جلد

---

[1] صحیح بخاری : کتاب البیوع ،باب کم یجوز الخیار

بازی میں غور وفکر کے بغیر ہی ہو جاتی ہے، لہذا یہ شریعت کاملہ کی خوبیوں میں سے ہے کہ اس نے ایک حد (جب تک دونوں فریق بیع کی جگہ موجود ہیں) مقرر کر دی ہے جس میں دونوں فریق اپنے فیصلے پر غور وفکر اور نظر ثانی کر لیں۔''[1]

لیکن اگر مشتری جدا ہونے سے قبل خریدی گئی چیز میں تصرف کر لے مثلاً کسی کو ہبہ کر دے اور فروخت کنندہ اس پر اعتراض نہ کرے تو خیار مجلس ختم اور بیع لازم ہو جاتی ہے۔[2]

بعض اہل علم کے نزدیک اگر دونوں یا ایک بیع کرتے وقت یہ واضح کر دے کہ بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا تو پھر بھی دونوں یا جس نے یہ حق ختم کیا اس کا اختیار ساقط ہو جائے گا اور بیع لازم ہو جائے گی۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے۔

'إِذَا تَبَايَعَ الرَّجُلَانِ فَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا وَكَانَا جَمِيعًا أَوْ يُخَيِّرُ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ'

''جب دو شخص بیع کریں تو ہر ایک کو اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں یعنی اکھٹے ہوں یا ایک دوسرے کو اختیار نہ دے دیں۔''[3]

یہ حضرات ایک دوسرے کو اختیار دینے کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جب فریقین یا ان سے ایک لین دین کرتے وقت یہ شرط لگا لے کہ خیار مجلس نہیں ہوگا تو یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں کیونکہ یہ خیار کی حکمت وفلسفہ کے خلاف ہے۔ ہماری ناقص رائے میں اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جب تک فریقین بیع کی جگہ پر موجود ہوں ان کے درمیان بیع لازم نہیں ہوتی سوائے اس بیع کے جس میں وہ ایک دوسرے کو جدا ہونے کے بعد بھی طے شدہ مدت تک بیع فسخ قرار دینے کا اختیار دے دیں، یعنی اس صورت میں جدائی سے قبل ہی بیع لازم ہو جاتی ہے البتہ

---

① اعلام الموقعین ج 3، ص 164.

② صحیح بخاری : باب اذا اشتری شیئافوھب من ساعته قبل ان یتفرقا.

③ صحیح بخاری، باب اذا خیر احدھماصاحبه .

طے شدہ مدت تک بیع منسوخ کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔

'كُلُّ بَيِّعَيْنِ لَا بَيْعَ بَيْنَهُمَا حَتَّى يَتَفَرَّقَا إِلَّا بَيْعَ الْخِيَارِ '

''خرید وفروخت کرنے والوں کے درمیان بیع (لازم) نہیں ہوگی یہاں تک وہ جدا ہوں جائیں سوائے اس بیع کے جس میں وہ ایک دوسرے کو اختیار دے دیں۔''[1]

خیار شرط

جب فروخت کنندہ یا مشتری خریداری کا معاملہ کرتے وقت یہ کہے کہ مجھے اتنی مدت تک بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا اور دوسرا فریق بھی اس پر راضی ہو تو اس کو خیار شرط کہتے ہیں۔ یہ جائز ہے اس کی دلیل نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

'الْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ '

''مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہیں۔''[2]

تاہم اس کو سود کا ذریعہ بنانا جائز نہیں، لہذا اگر قرض دہندہ قرض پر اضافی رقم لینے کی بجائے قرض لینے والے کی کوئی جائیداد خرید لے اور یہ طے کرلے کہ مجھے اتنی مدت تک بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا تاکہ دوران مدت اس جائیداد سے فائدہ اٹھا سکے اور جب مدت پوری ہو تو خیار شرط کے تحت بیع فسخ کردے تو یہ جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہ سودی حیلہ ہے۔ چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا:

''کہ ایک شخص دوسرے سے کوئی چیز مثلاً زمین خریدتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ آپ کو فلاں مدت تک بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے، تو انہوں نے فرمایا جائز ہے بشرطیکہ حیلہ مقصود نہ ہو۔ حیلہ سے مراد یہ ہے کہ وہ قرض لینے والے سے کوئی جائیداد خرید کر اس سے فائدہ

---

[1] باب اذا کان البائع بالخیار هل یجوز البیع.

[2] سنن ابی داؤد: باب فی الصلح.

اٹھائے اور اس میں خیار کی شرط طے کر لے تا کہ اس حیلے کے ذریعے قرض کے بدلے فائدہ حاصل کرے۔''[1]

بیع کی وہ اقسام جن میں فروخت کی گئی چیز اور اس کے معاوضہ پر وقوع بیع کے مقام پر ہی قبضہ شرط ہے، جیسے گندم کی گندم، سونے کی سونے کے عوض بیع اور کرنسی کی خرید وفروخت ہے، یا وقوع بیع کے وقت مکمل قیمت کی ادائیگی ضروری ہے جیسا کہ بیع سلم میں ہے وہاں بھی خیار شرط کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'أن البيوع التي يشترط فيها التقابض في المجلس كالصرف وبيع الطعام بالطعام أو القبض في أحد العوضين كالسلم لا يجوز شرط الخيار فيها'

''بیع کی وہ صورتیں جن میں دونوں طرف سے موقع پر قبضہ شرط ہے، جیسے کرنسی کی خرید وفروخت، یا غلّے کی غلّے کے عوض بیع ہے۔ یا مکمل قیمت کی پیشگی ادائیگی ضروری ہے، جیسا کہ بیع سلم میں ہے، ان میں خیار شرط جائز نہیں۔''[2]

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بیع کی جن اقسام میں وقوع بیع کے جگہ پر ہی قبضہ شرط ہے جیسے بیع صرف (کرنسی کی خرید وفروخت)، بیع سلم اور ان اجناس کی باہم بیع ہے جن کا کمی بیشی کے ساتھ باہمی تبادلہ سود ہے ان میں خیار شرط نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا مطلب ہے کہ فریقین کے جدا ہونے کے بعد ان کے درمیان کوئی تعلق باقی نہ رہے جبکہ خیار شرط کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے درمیان (خیار کی مدت تک) تعلق باقی رہے گا۔''[3]

---

[1] المغنی ج 7، ص 486.

[2] روضۃ الطالبین: ج؟، ص 439.

[3] المغنی: ج7، ص 488.

خیار تدلیس

مشتری کو اندھیرے میں رکھ کر کوئی چیز فروخت کی جائے تو اسے تدلیس کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں شریعت مشتری کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ حقیقت حال واضح ہونے پر بیع فسخ کر سکتا ہے۔

تدلیس کی یہ صورت تو زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے کہ بعض بیوپاری دودھ دینے والے جانور کو منڈی میں لے جانے سے قبل کچھ وقت کے لیے اس کا دودھ نہیں دوہتے تاکہ خریدار کو تھن بھرے نظر آئیں اور وہ یہ سمجھے کہ اچھی مقدار میں دودھ دینے والا جانور ہے لیکن جب جانور کو گھر لے جا کر دودھ دوہتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دودھ کی حقیقی مقدار بہت کم ہے۔ نبی ﷺ نے اس حربے کو ممنوع قرار دیا اور فرمایا جس نے ایسا جانور خرید لیا اس کو دو باتوں میں اختیار ہے۔ اگر اپنے سودے پر مطمئن ہے تو اسے باقی رکھے اور اگر مطمئن نہیں تو اس کو فسخ کر دے یعنی جانور واپس کر کے اپنی رقم لے لے اور دودھ کے بدلے ایک صاع کھجور دے۔[1]

بعض لوگ حادثہ شدہ گاڑیوں کو مرمت کر کے غیر حادثہ شدہ کا تاثر دے کر فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ بھی تدلیس کی ایک شکل ہے جو حرام ہے۔

خیار غبن

غبن کا معنی ہے "دھوکہ دہی اور کمی کرنا" جب کسی شخص سے دھوکہ دہی یا اس کی ناواقفیت اور اعتماد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی چیز مارکیٹ کی نسبت بہت زیادہ سستی خرید لی جائے یا معمول سے زیادہ مہنگی بیچ دی جائے تو اس کو اصطلاح میں غبن کہتے ہیں جو کہ حرام ہے۔

عہد نبوت میں مدینہ منورہ میں غلہ وغیرہ دوسرے شہروں سے لا کر ہی فروخت کیا جاتا تھا، بعض چالاک تاجر منڈی سے باہر جا کر ہی تجارتی قافلوں سے سارا مال خرید لیتے تھے، نبی اکرم ﷺ

---

[1] صحیح بخاری : کتاب البیوع ،باب النھی للبائع أن لا یحفل الابل والبقر والغنم

اس پر پابندی لگا دی، کیونکہ اس میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ تاجر قافلے والوں کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر سستے داموں نہ خرید لیں۔اور اگر کوئی مالک تاجر پر اعتماد کر کے اپنا مال فروخت کردے اور وہ منڈی میں پہنچ کر یہ محسوس کرے کہ تاجر نے جو قیمت دی ہے وہ صحیح نہیں، حقیقی قیمت یہ ہے تو اس کو یہ اختیار ہوگا کہ چاہے تو بیع باقی رکھے اور چاہے تو منسوخ کردے۔چنانچہ آپ کا فرمان ہے:

'لَا تَلَقَّوُا الْجَلَبَ فَمَنْ تَلَقَّاهُ فَاشْتَرَى مِنْهُ فَإِذَا أَتَى سَيِّدُهُ السُّوقَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ'

''قافلے والوں سے آگے جا کر نہ ملو۔جس نے آگے جا کر مال خرید لیا تو جب مال کا مالک بازار پہنچے تو اس کو (معاملہ فسخ کرنے کا) اختیار ہوگا۔''[1]

علمائے احناف خیار غبن کے قائل نہیں، وہ کہتے ہیں جو شخص بازار میں جائے اس کا فرض ہے کہ مارکیٹ کا ریٹ معلوم کر کے علی وجہ البصیرۃ بیع کرے۔اگر اس نے مارکیٹ ریٹ معلوم کئے بغیر بیع کر لی اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو دھوکہ لگا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے اس کو بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔یہ رائے متذکرہ بالا حدیث کے خلاف ہے۔خود حنفی علماء بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ حدیث خیار غبن کی مضبوط ترین دلیل ہے، ہمارے پاس اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ہے۔چنانچہ معروف حنفی عالم مولانا تقی عثمانی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

''یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں آپ ﷺ نے دیہاتی (مال لانے والے) کو جو اختیار دیا یہ خیار مغبون کے سوا اور کچھ نہیں۔اس حدیث کا کوئی اطمینان بخش جواب شافعیہ اور حنفیہ کے پاس نہیں ہے۔اور شاید یہی وجہ ہے کہ متاخرین حنفیہ نے اس مسئلہ میں امام مالک کے قول پر فتوی دیا۔''

''علامہ ابن عابدین (شامی) رد المحتار میں فرماتے ہیں کہ آج کل دھوکہ بازی بہت عام ہوگئی ہے لہٰذا ایسی صورت میں مالکیہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے مغبون کو اختیار

---

[1] صحيح مسلم : باب تحريم تلقي الجلب.

دیا جائے گا۔ کیونکہ دھوکہ اسی شخص کے کہنے کی بنا پر ہوا ہے۔ ویسے ہی دھوکہ لگ گیا تو بات دوسری ہے لیکن جب اس نے کہا کہ بازار میں یہ دام ہے اور بعد میں بازار میں وہ دام نہیں نکلے تو یہ دھوکہ اس کے کہنے کی وجہ سے ہوا لہٰذا دوسرے فریق کو اختیار ہے فتوی بھی اسی کے اوپر ہے۔''[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

''حنفیہ کے پاس اس حدیث کا کوئی جواب نہیں ہے۔ لہٰذا اس باب میں ائمہ ثلاثہ کا مسلک راجح ہے۔''[2]

خیار عیب

اگر چیز خریدنے کے بعد اس میں کسی ایسے نقص کا انکشاف ہو جو فروخت کنندہ کے ہاں سے ہی موجود تھا لیکن بیع کے وقت خریدار کے علم میں نہ آسکا تو خریدار کو بیع منسوخ کر کے اپنی رقم واپس لینے کا اختیار ہے، اس کو خیار عیب کہتے ہیں۔ نقص سے مراد ایسا عیب ہے جس سے قیمت میں کمی واقع ہو۔

مشتری رضامند ہو تو خیار عیب میں تصفیہ کی ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس چیز کی نقص کے ساتھ اور بغیر نقص کے قیمت لگائی لی جائے، دونوں قیمتوں میں جو فرق ہو وہ رقم مشتری کو واپس کردی جائے اور بیع کو قائم رکھا جائے۔

خیار عیب کی غرض وغایت مشتری کو ضرر سے بچانا ہے کیونکہ وہ چیز کو بے عیب سمجھ کر خریدنے پر رضامند ہوا تھا، نقص کی موجودگی اس کی رضامندی کے خلاف ہے، اس لیے علمائے دین کے مابین اس کی مشروعیت متفق علیہ ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہے:

---

[1] انعام الباری ج6، ص228.

[2] ایضاً ص304۔

'أَنَّ رَجُلًا اشْتَرَى عَبْدًا فَاسْتَغَلَّهُ ثُمَّ وَجَدَ بِهِ عَيْبًا فَرَدَّهُ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّهُ قَدِ اسْتَغَلَّ غُلَامِي فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ '

''ایک شخص نے ایک غلام خریدا، پھر اس سے (اجرت کے بدلے کام پر لگا کر) فائدہ اٹھایا، بعد میں اس میں عیب پایا اور اسے واپس کر دیا۔اس پر فروخت کنندہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اس نے میرے غلام سے فائدہ بھی تو اٹھایا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا فائدہ نقصان کی ذمہ داری کی بنیاد پر ہے۔''[1]

یعنی اس عرصہ میں چونکہ غلام کا ذمہ دار مشتری تھا، اگر وہ کسی وجہ سے ہلاک ہو جاتا تو مشتری کا ہی نقصان ہوتا اس لیے اجرت بھی اسی کا حق ہے۔

خیار بصورت اختلاف

جب معاملہ طے پانے کے بعد فروخت کنندہ اور مشتری کے درمیان قیمت وغیرہ میں اختلاف پیدا ہو جائے ،مثلا فروخت کنندہ کہے کہ میں نے اس کی قیمت ایک ہزار بتائی تھی اور خریدار کہے نو سو میں سودا طے ہوا تھا اور دونوں میں سے کسی کے پاس دلیل یا گواہ موجود نہ ہو تو فروخت کنندہ کی بات معتبر سمجھی جائے گی اور خریدار کو اختیار ہو گا کہ وہ بیع باقی رکھے یا فسخ کر دے۔

'إِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ فَهُوَ مَا يَقُولُ رَبُّ السِّلْعَةِ أَوْ يَتَتَارَكَانِ'

''جب فروخت کنندہ اور خریدار کا اختلاف ہو جائے اور دونوں میں سے کسی کے پاس دلیل نہ ہو تو فروخت کنندہ کی بات معتبر ہو گی یا پھر دونوں بیع ختم کر دیں۔''[2]

سنن ابن ماجہ میں ہے:

---

[1] سنن ابن ماجه : باب الخراج بالضمان.

[2] سنن ابي داؤد : باب اذا اختلف البيعان

أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ مَسْعُودٍ بَاعَ مِنَ الْأَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ رَقِيقًا مِنْ رَقِيقِ الْإِمَارَةِ فَاخْتَلَفَا فِي الثَّمَنِ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ بِعْتُكَ بِعِشْرِينَ أَلْفًا وَقَالَ الْأَشْعَثُ بْنُ قَيْسٍ إِنَّمَا اشْتَرَيْتُ مِنْكَ بِعَشَرَةِ آلَافٍ فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ إِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ بِحَدِيثٍ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ هَاتِهِ قَالَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ وَالْبَيْعُ قَائِمٌ بِعَيْنِهِ فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ أَوْ يَتَرَادَّانِ الْبَيْعَ قَالَ فَإِنِّي أَرَى أَنْ أَرُدَّ الْبَيْعَ فَرَدَّهُ'

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اشعث بن قیس کو سرکاری غلاموں میں سے ایک غلام فروخت کیا۔ پھر دونوں کا قیمت کے متعلق اختلاف ہو گیا، حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے تھے میں نے تجھے بیس ہزار میں بیچا ہے جبکہ اشعث بن قیس کا دعوی تھا کہ میں نے آپ سے صرف دس ہزار میں خریدا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا اگر آپ چاہیں تو میں آپ سے ایک حدیث بیان کرتا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے، اشعث نے کہا بیان کرو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ فروخت کنندہ اور خریدار کا اختلاف ہو جائے اور کسی کے پاس گواہ نہ ہو اور فروخت کی گئی چیز بعینہ موجود ہو تو فروخت کنندہ کا دعوی درست مانا جائے گا، یا دونوں بیع فسخ کر دیں۔ اشعث نے کہا میرا خیال ہے کہ میں بیع فسخ کر دوں چنانچہ انہوں نے بیع فسخ کر دی۔''[1]

قیمت خرید غلط بتانے کی وجہ سے خیار

جب فروخت کنندہ کوئی چیز اس دعوی کے ساتھ فروخت کرے کہ وہ اپنی لاگت قیمت سے

---

[1] باب البیعان یختلفان .

صرف اتنے روپے زائد منافع لے رہا ہے جیسا کہ مرابحہ میں ہوتا ہے یا اپنی لاگت قیمت پر ہی بیچ رہا ہے جیسا کہ بیع تولیہ میں ہے یا اپنی لاگت سے اتنے روپے کم وصول کر رہا ہے جیسا کہ بیع وضعیہ میں ہوتا ہے اور بعد میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے غلط بیانی کی ہے تو مشتری کو بیع منسوخ کرنے کا اختیار ہے۔ کیونکہ ان صورتوں میں مشتری فروخت کنندہ پر اعتماد کر کے بیع کرتا ہے ،لہذا ان کا ہر قسم کی خیانت اور شبہات سے پاک ہونا اور خریدار کو لاگت قیمت کا علم ہونا ضروری ہے جو فروخت کنندہ کی غلط بیانی کی وجہ سے نہیں ہو سکا، اس لیے خریدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیع ختم کر دے۔

تغیر واقع ہونے کی وجہ سے اختیار

اس سے مراد یہ ہے کہ مشتری نے ایک ایسی چیز کا سودا کر لیا جو اس نے معاملہ طے پانے سے کافی عرصہ پہلے دیکھی تھی لیکن جب سودا طے پانے کے بعد سامنے آئی تو اس میں تبدیلی آ چکی تھی، اب مشتری کو اختیار ہے کہ بیع باقی رکھے یا منسوخ کر دے۔ کیونکہ تبدیلی پیدا ہونے کے بعد مذکورہ چیز وہ نہیں رہی جس کا مشتری نے خریداری سے قبل مشاہدہ کیا تھا لہذا یہ بیع ختم کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قابل ذکر تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو تو پھر مشتری کو بیع ختم کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ شرعی اصول وضوابط کی روشنی میں خیار کی فیس لی جا سکتی ہے اور نہ ہی یہ حق کسی دوسرے کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔

اختیارات (Options) کی بیع

اختیار کا جدید مفہوم

شریعت میں اختیار (Option) کا مفہوم تو وہی ہے جو گزشتہ سطور میں سپرد قلم کیا جا چکا ہے لیکن سرمایہ داری نظام معیشت میں اختیار کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔ جدید معاشی ماہرین کے نزدیک اختیار سے مراد ہے۔

'عقد یخول لحامله الحق ببیع او شراء اوراق مالیة اوسلع معینة بسعر معین طیلة فترة زمنیة معینة '

"ایسا عقد جو اختیار (Option) لینے والے کو ایک خاص مدت تک طے شدہ قیمت پر فنانشل پیپرز یا متعین اجناس خریدنے یا بیچنے کا حق دے۔"[1]

اختیار دینے کی باقاعدہ فیس لی جاتی ہے اور معاصر معیشت میں اس کو مستقل مال شمار کیا جاتا ہے جو کسی دوسرے کو فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔

عقد اختیار میں دو فریق ہوتے ہیں۔

اختیار کا خریدار: (مشتری الاختیار) اس سے مراد وہ شخص ہے جو فیس دے کر خریدنے یا بیچنے کا اختیار حاصل کرتا ہے۔

اختیار کا فروخت کنندہ: (محرر الاختیار) جو فیس وصول کر کے بیچنے یا خریدنے کا اختیار دیتا ہے۔

---

[1] فقه البیوع المنهی عنها مع تطبیقاتها الحدیثة فی المصارف الاسلامیة، للدکتور احمد ریان: ص25.

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اختیار کا خریدار اگر چیز خریدنا یا بیچنا چاہے تو اختیار دینے والا اس کی مرضی کا پابند ہوتا ہے کیونکہ اس نے فیس وصول کی ہوتی ہے لیکن اختیار لینے والا خریدنے یا بیچنے کا پابند نہیں ہوتا۔

فائدہ: اختیار دہندہ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اختیار دیتے وقت اس چیز کا مالک بھی ہو بلکہ غیر ملکیتی چیز کا اختیار بھی دے سکتا ہے۔ ماہرین معیشت کی اصطلاح میں اس کو اوپن آپشن (خیار مکشوف) کہا جاتا ہے۔ اگر اختیار دیتے وقت وہ چیز اس کی ملکیت میں ہو تو اس کو کورڈ آپشن (خیار مغطی) کہتے ہیں۔

اختیار کی قسمیں

اختیار کی بنیادی قسمیں دو ہیں۔

1. اگر خریدنے کا اختیار لیا گیا ہو، تو اس کو Call Option (اختیار الشراء) کہتے ہیں۔
2. اور اگر بیچنے کا ہو، تو اس کو Put Option (اختیار البیع) کہتے ہیں۔

خریداری اختیار کا مقصد

خریداری اختیار (Call Option) لینے کا پہلا مقصد خرید وفروخت کے ذریعے قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے فائدہ اٹھانا ہے۔ مثلاً کسی کمپنی کے ایک سو شیئرز ہیں، شیئر کی موجودہ قیمت ایک سو روپیہ ہے ''الف'' کے خیال میں ایک مہینہ تک اس شیئر کی قیمت میں کمی واقع ہو سکتی ہے جبکہ ''ب'' کے نزدیک اس عرصہ میں مذکورہ شیئر کی قیمت بڑھنے کی توقع ہے۔ لہٰذا ''ب'' ''الف'' کو پانچ روپے فی شیئر فیس ادا کر کے ایک مہینہ تک اس قیمت پر مذکورہ شیئرز خریدنے کا اختیار لے لیتا ہے۔ اس مثال میں ''ب'' اختیار کا خریدار (مشتری الاختیار) اور ''الف'' فروخت کنندہ (محرر الاختیار) ہے۔ اب یہاں تین حالتیں پیش آ سکتی ہیں۔

1. مقررہ تاریخ تک شیئر کی قیمت پانچ روپے سے زائد بڑھ گئی ہے، مثلاً ایک سو چھ روپے ہو گئی

ہے تو ''ب'' ''الف'' سے ایک سو روپے فی شیئر کے حساب سے وہ شیئرز خرید کر مارکیٹ میں ایک سو چھ میں فروخت کردے گا۔ اس طرح اسے پانچ سو روپے آپشن فیس ادا کرنے کے بعد ایک سو روپے کا فائدہ ہوجائے گا جبکہ ''الف'' کو ایک صد کا نقصان ہوگا۔

2. شیئر کی قیمت کم ہوکر نوے روپے رہ گئی ہے تو اس صورت میں ''ب'' ''الف'' سے شیئرز نہیں خریدے گا کیونکہ مارکیٹ میں اس قیمت گر چکی ہے۔ اگر اسے شیئرز سے دلچسپی ہوئی بھی تو وہ ''الف'' سے ایک سو میں خریدنے کی بجائے مارکیٹ سے نوے روپے کے حساب سے خریدے گا۔ کیونکہ اس طرح اس کا نقصان آپشن فیس تک ہی محدود رہے گا جو کہ پانچ سو روپے ہے اور یہی پانچ سو ''الف'' کا منافع ہے۔

3. شیئر کی قیمت میں اضافہ تو ہوا ہے مگر آپشن فیس پانچ روپے سے کم۔ مثلاً تین روپے اضافہ ہو گیا ہے، تب بھی اختیار کا خریدار ''ب'' وہ شیئرز خرید لے گا۔ اگرچہ اس صورت میں اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا، تاہم اس کا خسارہ کم ہو جاتا ہے، کیونکہ نہ خریدنے کی صورت میں پوری آپشن فیس رائیگاں جاتی ہے جبکہ خریداری کی صورت میں صرف تین سو روپے کا نقصان ہے۔

خریداری اختیار (Call Option) لینے کا دوسرا مقصد قیمتوں میں ممکنہ اضافے سے پیشگی تحفظ اور متوقع کمی سے فائدہ اٹھانا ہے، یعنی خریداری اختیار احتیاطی تدبیر کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے۔

''الف'' کے ذمہ ایک ہزار امریکی ڈالر قرض ہے جو اس نے تین ماہ بعد ادا کرنا ہے۔ ڈالر کی موجودہ قیمت اسّی روپے ہے۔ ''الف'' اس کشمکش میں ہے کہ وہ ابھی ڈالر خرید لے یا ادائیگی کے موقع پر خریدے۔ کیونکہ اگر وہ ابھی خرید لیتا ہے اور ادائیگی تک اس کی قیمت کم ہو جاتی ہے تو اس کا نقصان ہے کیونکہ اس نے ڈالر مہنگے داموں خریدا ہوا ہے۔ اور اگر اس وقت نہیں خریدتا تو ممکن ہے ادائیگی تک اس کی قیمت بڑھ جائے اور اسے مہنگے داموں خریدنا پڑے، یہ بھی خسارے کا سودا

ہو گا۔لہذا ''الف'' ''ب'' کوایک روپیہ فی ڈالرفیس ادا کر کے تین مہینوں تک اسّی روپے فی ڈالر ایک ہزارڈالرخریدنے کا اختیار لے لیتا ہے۔اب اگر مقررہ تاریخ تک روپے کے مقابلہ میں ڈالر کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو وہ ''ب'' سے اسی روپے کے حساب سے ایک ہزار ڈالرخرید لے گا۔اور اگر کمی واقع ہوتی ہے تو وہ ''ب'' سے خریدنے کی بجائے مارکیٹ سے خریدے گا۔اس صورت میں اگر چہ اسے آپشن فیس کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا تاہم مارکیٹ سے ڈالرستامل جائے گا۔

بیچنے کا اختیار(Put Option)

اس میں اگر اختیار لینے والا فروخت کرنا چاہے تو اختیار دہندہ خریدنے کا پابند ہوتا ہے جبکہ خریداری اختیار میں بیچنے کی پابندی تھی یعنی یہ خریداری اختیار کے برخلاف ہے۔اس کا پہلا مقصد خریدوفروخت کے ذریعے قیمتوں کی کمی سے فائدہ اٹھانا ہے۔مثلاً ''الف'' ''ب'' کوایک سوروپیہ آپشن فیس ادا کر کے ایک مہینے تک کسی کمپنی کے ایک سوشیئرز پچاس روپے فی شیئرز کے حساب سے فروخت کرنے کا اختیار خرید لیتا ہے۔اب اگر اس عرصہ میں شیئر کی قیمت گر گئی تو ''الف'' وہ شیئرز طے شدہ قیمت پر ''ب'' کوفروخت کر دے گا۔لیکن اگر قیمت میں اضافہ ہو گیا تو ''ب'' کو بیچنے کی بجائے مارکیٹ میں فروخت کرنے کو ترجیح دے گا۔اس صورت میں اگر چہ اس کی آپشن فیس رائیگاں جائے گی تاہم اسے دوسری طرف سے فائدہ ہو جائے گا۔

فروختنی اختیار کا دوسرا مقصد مستقبل میں ممکنہ نقصان سے پیشگی تحفظ ہے۔مثلاً ''الف'' کے پاس ایک امریکی ڈالر ہے جس کی حالیہ قیمت اسّی روپے ہے۔''الف'' اس کشمکش میں ہے کہ وہ یہ ڈالر اپنے پاس رکھے یا ابھی فروخت کر دے۔کیونکہ اگر وہ اپنے پاس رکھتا ہے تو اس کی قیمت گرنے کا احتمال ہے۔اور اگر ابھی فروخت کرتا ہے تو ممکن ہے آئندہ اس کی قیمت بڑھ جائے اور یہ نفع سے محروم رہے۔لہذا ''الف'' ''ب'' کو آپشن فیس ادا کر کے ایک مہینے تک اسی روپے میں ڈالر بیچنے کا اختیار خرید لیتا ہے۔اب اگر مقررہ تاریخ تک ڈالر کی قیمت بڑھ گئی تو وہ کسی دوسرے کو فروخت کر دے گا،اور اگر کم ہو گئی تو اسی روپے میں ''ب'' کو فروخت کر دے گا۔گویا ''الف'' یہ

اختیار حاصل کر کے ڈالر کی قیمت گرنے سے مطمئن ہو گیا ہے۔

اختیارات کی خرید وفروخت کا شرعی حکم

مذکورہ بالا تفصیلات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں رائج اختیارات اور شریعت کے تصور اختیار کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ اختیار کا شرعی مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ بیع باقی رکھنے یا فسخ کرنے میں سے جو صورت بہتر معلوم ہو اس کا انتخاب کر لیا جائے۔ اس کی نہ تو کوئی فیس مقرر ہوتی ہے اور نہ ہی یہ حق کسی دوسرے کو فروخت کیا جا سکتا ہے، جبکہ زیر بحث اختیار کسی چیز کو خریدنے یا بیچنے کا محض ایک حق ہے جو نہ تو مال ہے اور نہ ہی کسی چیز کا حق استعمال، نیز یہ ایسا مالی حق بھی نہیں جس کا معاوضہ لیا جا سکے۔ لہذا اس کی خرید وفروخت حرام ہے۔

مزید یہ کہ اختیارات کا لین دین ایک ایسا عمل ہے جو غرر اور سٹہ بازی جیسی قباحتوں پر مشتمل ہے۔ غرر اس طرح کہ اختیار کے استعمال کی نوبت آئیگی یا نہیں؟ اس کا علم نہ تو خود اختیار کے خریدار کو ہوتا ہے اور نہ ہی فروخت کنندہ کو۔ کیونکہ اس کا انحصار اس پر ہے کہ خریدار کی توقع کے مطابق قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر اس نے خریداری اختیار لیا ہو اور قیمتیں بڑھ جائیں تو وہ بیع کرے گا ورنہ نہیں۔ اسی طرح اگر اس نے بیچنے کا اختیار لے رکھا ہو تو صرف قیمت کم ہونے کی صورت میں اختیار دہندہ کو فروخت کرے گا، اضافے کی صورت میں کسی دوسرے کو بیچ دے گا۔ چونکہ قیمتوں میں کمی بیشی غیر یقینی امر ہے، اس لیے بیع کا انعقاد مبہم ہے اور یہی غرر ہے جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

سٹہ بازی اس طرح کہ اس سارے معاملے میں خرید وفروخت کی نیت قطعاً نہیں ہوتی بلکہ نیت صرف یہ ہوتی ہے کہ اگر فلاں تاریخ تک شیئرز کی قیمت بڑھ گئی تو اختیار دہندہ سے اتنے فیصد اضافہ وصول کر لیا جائے گا اور اگر کم ہو گئی تو اس کو اتنے فیصد اضافہ دے دیا جائے گا۔ یا اگر قیمتیں کم ہوں گئیں تو اتنے فیصد اضافہ وصول اور اگر بڑھ گئیں تو ادا کر دیا جائے گا۔ گویا یہ قسمت

لڑانے کا کھیل ہے جسے جوا کہا جاتا ہے۔یہی جوا شیئرز اور کرنسی کی جگہ دیگر اجناس کی بنیاد پر بھی کھیلا جاتا ہے۔

اگر آپشن اوپن ہو تو درج بالا خرابیوں کے ساتھ غیر ملکیتی چیز کا سودا کرنے کی خرابی بھی شامل ہو جاتی ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ

پہلا شبہ: علمائے دین بیعانہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔آپشن فیس بیعانہ کے مشابہ ہے کہ جس طرح بیعانہ دینے والا چیز نہ خرید سکے تو بیعانہ ضبط ہو جاتا ہے اسی طرح اگر اختیار لینے والا چیز نہ خریدے تو آپشن فیس ضبط ہو جاتی ہے۔مزید یہ کہ جس طرح بیعانہ میں مشتری کو مقررہ تاریخ تک چیز خریدنے کا حق ہوتا ہے اسی طرح اختیار میں بھی مشتری کو متعین تاریخ تک خریداری کا حق ہوتا ہے،لہٰذا بیعانہ کی طرح یہ بھی جائز ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے بیعانہ کے بارے میں جاننا ضروری ہے جسے علمائے دین نے جائز قرار دیا ہے۔جب کوئی کاروباری معاملہ اس طرح طے پائے کہ کچھ رقم پیشگی ادا کر کے یہ کہا جائے کہ اگر میں نے یہ چیز خرید لی تو یہ رقم قیمت کا حصہ شمار ہو گی اور اگر نہ خریدی تو یہ آپ کی ملکیت ہو گی تو اس کو''بیعانہ کی بیع''"بَیعُ الْعُرْبُوْن' کہا جاتا ہے۔چنانچہ سنن ابن ماجہ میں بیعانہ کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

'اَلْعُرْبَانُ أَنْ یَشْتَرِیَ الرَّجُلُ دَابَّةً بِمِائَةِ دِینَارٍ فَیُعْطِیَهُ دِینَارَیْنِ أَرْبُونًا فَیَقُولَ إِنْ لَمْ أَشْتَرِ الدَّابَّةَ فَالدِّینَارَانِ لَكَ'

''بیعانہ یہ ہے کہ آدمی (مثلاً) سو دینار کا جانور خریدے اور دو دینار بیعانہ کے طور پر دے کر یہ کہے کہ اگر میں نے یہ جانور نہ لیا تو یہ دو دینار تمھارے ہوں گے۔''[1]

---

[1] باب بیع العربان.

امام نووی رحمہ اللہ بیعانہ کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

'وهو أن يشترى شيئا ويعطى البائع درهما أو دراهم ويقول ان تم البيع بيننا فهو من الثمن والا فهو هبة لك'

"بیعانہ یہ ہے کہ آدمی کوئی چیز خریدے اور فروخت کنندہ کو ایک یا کچھ درہم دے کر یہ کہے کہ اگر ہمارے درمیان بیع مکمل ہوگئی تو یہ رقم قیمت کا حصہ شمار ہوگی بصورت دیگر یہ آپ کے لیے ہبہ ہوگی۔"[1]

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'والعربون فى البيع هو أن يشترى السلعة يدفع إلى البائع درهما أو غيره على أنه إن أخذ السلعة احتسب به من الثمن وإن لم يأخذها فذلك للبائع'

"بیع میں بیعانہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کوئی سامان خریدے، فروخت کنندہ کو اس شرط پر درہم وغیرہ دے کہ اگر اس نے سامان لے لیا تو یہ رقم قیمت سے وضع کر لی جائے گی اور اگر نہ لیا تو یہ رقم فروخت کنندہ کی ہوگی۔"[2]

بیعانہ کی مذکورہ بالا تعریفات سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔

1. خریداری کی صورت میں بیعانہ کی رقم قیمت کا حصہ بن جاتی ہے۔
2. بیعانہ میں صرف مشتری کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ چیز خریدے یا نہ خریدے، فروخت کنندہ بیچنے کا پابند ہوتا ہے۔

لیکن اختیارات کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں نہ تو آپشن فیس قیمت کا حصہ بنتی ہے اور نہ ہی فروخت کنندہ پر بیچنے کی پابندی ہوتی ہے بلکہ اختیار دہندہ پابند ہوتا ہے، قطع نظر اس بات

---

[1] المجموع ج 9 ص 335.

[2] المغنی ج 4، ص 312.

کے کہ وہ خریدار ہے یا فروخت کنندہ۔

اس کے علاوہ بھی کئی لحاظ سے ان میں فرق ہے۔مثلاً بیعانہ میں چیز کا حصول پیش نظر ہوتا ہے جبکہ اختیارات میں چیز کے حصول کی بجائے قیمتوں میں واقع فرق کا لین دین کیا جاتا ہے۔اسی طرح اختیارات کی باقاعدہ خرید وفروخت ہوتی ہے لیکن بیعانہ میں ایسا نہیں ہے۔لہذا آپشن فیس کو بیعانہ پر قیاس کرنا درست نہیں۔

دوسرا شبہ: عقد اختیار حقیقت میں خرید وفروخت کا وعدہ ہے جو ایک نیکی ہے اور آپشن فیس کے نام پر دی گئی رقم اس نیکی کا صلہ ہے۔

یہ توجیہ بھی غلط فہمی پر مبنی ہے۔نہ تو خرید وفروخت کے وعدے کو نیکی قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اختیار کو وعدہ قرار دینے کی کوئی گنجائش موجود ہے۔کیونکہ اس کی باقاعدہ فیس لی جاتی ہے جس سے یہ عقد معاوضہ کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

تیسرا شبہ: اختیارات اور خیار شرط باہم ملتے جلتے ہیں،خیار شرط جائز ہے اس لیے یہ بھی جائز ہونا چاہیے۔

یہ بات بھی صحیح نہیں کہ اختیارات کا لین دین خیار شرط کے مشابہ ہے۔خیار شرط کا معاوضہ لیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کے لیے عقد بیع سے الگ کوئی عقد ہوتا ہے جبکہ اختیار دینے کا معاوضہ وصول کیا جاتا ہے اور اس کے لیے علیحدہ عقد بھی طے پاتا ہے۔لہٰذا اس کو خیار شرط کے مشابہ قرار دینا بعید از قیاس ہے۔اور اگر اسے خیار شرط پر قیاس کر بھی لیا جائے تب بھی یہ جائز نہیں بنتا،کیونکہ خیار شرط کا معاوضہ جائز نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں رائج اختیارات کا لین دین حرام ہے ان کو بیعانے اور خیار شرط پر قیاس کرنا قیاس باطل ہے۔

بیعانہ کی شرعی حیثیت

سابقہ بحث کے ضمن میں اس نکتے کی وضاحت تو ہو چکی ہے کہ آئمہ حدیث وفقہ کے نزدیک بیعانہ کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اس میں صرف مشتری کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ ڈیل مکمل کرے یا نہ کرے، فروخت کنندہ بیچنے کا پابند ہوتا ہے تاہم جب تک اس کی شرعی حیثیت پر مفصل گفتگو نہ ہو یہ ساری بحث تشنۂ تکمیل رہے گی۔

بیعانہ کی بنیاد پر خرید وفروخت کے حوالے سے اہل علم کے دو گروہ ہیں۔ امام مالک، امام شافعی، فقہائے احناف اور حنبلی فقہاء میں سے ابو خطاب کی رائے میں بیعانہ کی صورت میں خرید وفروخت درست نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'وَاخْتَارَ أَبُو الْخَطَّابِ أَنَّهُ لَا يَصِحُّ وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَأَصْحَابِ الرَّأْيِ يُرْوَى ذَلِكَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَالْحَسَنِ'

''ابو خطاب نے یہ اختیار کیا ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ مالک، شافعی اور اصحاب رائے کا بھی یہی قول ہے۔ نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری سے بھی یہی مروی ہے۔''[1]

کویت کے فقہی انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

'فجمهورهم من الحنفيّة والمالكيّة والشّافعيّة، وأبو الخطّاب من الحنابلة، يرون أنّه لا يصحّ، وهو المرويّ عن ابن عبّاس رضی اللہ عنہما والحسن كما يقول ابن قدامة'

---

[1] المغنى فصل فى بيع العربون .

''جمہور حنفی، شافعی، مالکی فقہاء اور حنبلی علماء میں سے ابو خطاب کے خیال میں یہ جائز نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رحمہ اللہ سے بھی یہی مروی ہے جیسا کہ ابن قدامہ نے کہا ہے۔''[1]

جبکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک بیعانے کے لین دین میں کوئی حرج نہیں ہے۔

چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'قَالَ أَحْمَدُ لَا بَأْسَ بِهِ'

''امام احمد کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''[2]

علامہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا رجحان بھی اس کے حق میں ہے۔[3]

سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ بھی اسے جائز قرار دیتے ہیں:

'لاحرج فی أخذ العربون فی أصح قولی العلماء إذا اتفق البائع والمشتری علی ذلك ولم یتم البیع'

''علماء کے دو اقوال میں سے صحیح قول کے مطابق جب بائع اور مشتری اس پر اتفاق کر لیں اور بیع مکمل نہ ہو تو بیعانہ ضبط کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''[4]

اسی طرح ان کی سربراہی میں قائم دائمی فتوی کمیٹی نے بھی ایک استفتاء کے جواب میں اسے جائز کہا ہے:

'بیع العربون جائز، وهو أن یدفع المشتری للبائع أو وکیله مبلغًا من المال أقل من ثمن المبیع بعد تمام عقد البیع، لضمان المبیع؛ لئلا

---

① ج 10، ص 100.

② المغنی فصل فی بیع العربون .

③ اعلام الموقعین فصل الحیلة فی الصلح عن الحال .

④ فتاوی اسلامیه ج 2، ص 837.

یأخذه غيره على أنه إن أخذ السلعة احتسب به من الثمن، وإن لم یأخذها فللبائع أخذه وتملكه، وبيع العربون صحيح، سواء حدد وقتًا لدفع باقي الثمن أو لم يحدد وقتًا'

"بیعانہ کی بیع جائز ہے۔ بیعانہ کی بیع یہ ہے کہ مشتری عقد بیع کی تکمیل کے بعد اس غرض سے کہ چیز کوئی دوسرا نہ خرید لے فروخت کنندہ یا اس کے ایجنٹ کو چیز کی قیمت سے کم کچھ رقم اس شرط پر دے کہ اگر اس نے چیز لے لی تو یہ رقم قیمت میں شمار ہوگی اور اگر نہ لی تو یہ رقم فروخت کنندہ کی ہوگی۔ بیعانہ کی بیع صحیح ہے خواہ باقی قیمت کی ادائیگی کے لئے وقت کا تعین ہوا ہو یا نہ۔"[1]

پہلے گروہ کے دلائل

جو حضرات بیعانہ کی بیع کو ناجائز سمجھتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں۔

1. سودا طے نہ پانے کی صورت بیعانہ کی ضبطی مال ناحق ہے کیونکہ فروخت کنندہ یہ مال بغیر کسی معاوضہ کے حاصل کرتا ہے جس سے قرآن حکیم نے سختی سے منع کیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾

"اے ایمان والو! ایک دوسرے کے اموال ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ۔"[2]

علامہ ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان ناحق طریقوں سے مال کھانے کی ایک صورت بیعانہ بھی ہے۔[3]

2. عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ اپنے دادا یعنی سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے

---

① فتاوی اللجنة الدائمة ج 15 ص 202.

② النساء: 29.

③ احکام القرآن لابن العربی ج 1، ص 429.

بیان کرتے ہیں:

'نهى رسول الله ﷺ عن بيع العربان))

''رسول اللہ ﷺ نے بیعانہ کی بیع سے منع فرمایا۔''[1]

3. اس میں غرر یعنی بے یقینی کی کیفیت (uncertainty) پائی جاتی ہے کیونکہ یہ طے نہیں ہوتا کہ بیعانہ دینے والا ضرور خریدے گا بلکہ اس کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو ڈیل مکمل کرے اور چاہے تو رد کر دے۔ چنانچہ علامہ محمد بن اسماعیل الصنعانی رحمہ اللہ مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں:

'فَأَبْطَلَهُ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ لِهَذَا النَّهْيِ وَلِمَا فِيهِ مِنَ الشَّرْطِ الْفَاسِدِ وَالْغَرَرِ وَدُخُولِهِ فِي أَكْلِ الْمَالِ بِالْبَاطِلِ'

''امام مالک اور شافعی نے بیعانہ کی بیع کو اس نہی کی وجہ سے ناجائز کہا ہے اور یہ اس لئے بھی ناجائز ہے کہ اس میں شرط فاسد اور غرر پایا جاتا ہے اور یہ باطل طریقے سے مال کھانے کے زمرہ میں آتی ہے۔''[2]

4. یہ دو فاسد شرطوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ امام شوکانی رحمہ اللہ اس کے عدم جواز کی وجوہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

'وَالْعِلَّةُ فِي النَّهْيِ عَنْهُ اشْتِمَالُهُ عَلَى شَرْطَيْنِ فَاسِدَيْنِ أَحَدُهُما شَرْطُ كَوْنِ مَا دَفَعَهُ إِلَيْهِ يَكُونُ مَجَّانًا إِنْ اخْتَارَ تَرْكَ السِّلْعَةِ ، وَالثَّانِي شَرْطُ الرَّدِّ عَلَى الْبَائِعِ إِذَا لَمْ يَقَعْ مِنْهُ الرِّضَا بِالْبَيْعِ'

''ممانعت کی علت یہ ہے کہ یہ دو فاسد شرطوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ اگر چیز نہ لی تو بیعانہ کی رقم بغیر معاوضہ کے فروخت کنندہ کی ہوگی اور دوسری یہ کہ اگر خریدار بیع پر راضی

---

① سنن ابی داؤد باب فی العربان .

② سبل السلام ج 4 ص 99.

نہ ہوا تو چیز واپس فروخت کنندہ کو مل جائے گی۔" [1]

دوسرے گروہ کے دلائل

جن حضرات کے نزدیک بیعانہ کی بنیاد پر خرید وفروخت صحیح ہے ان کے دلائل یہ ہیں۔

1. حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

'أن النبی ﷺ أحل العربان فی البیع '

"بے شک نبی ﷺ نے بیع میں بیعانہ کو جائز قرار دیا ہے۔" [2]

2. صحیح بخاری میں ہے:

'وَاشْتَرَى نَافِعُ بْنُ عَبْدِ الْحَارِثِ دَارًا لِلسِّجْنِ بِمَكَّةَ مِنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ عَلَى أَنَّ عُمَرَ إِنْ رَضِيَ فَالْبَيْعُ بَيْعُهُ ، وَإِنْ لَمْ يَرْضَ عُمَرُ فَلِصَفْوَانَ أَرْبَعُمِائَةٍ '

"نافع بن عبدالحارث نے مکہ میں صفوان بن امیہ سے قید خانہ کے لیے ایک گھر اس شرط پر خریدا کہ اگر حضرت عمر راضی ہو گئے تو بیع مکمل ہو جائیگی اور اگر حضرت عمر راضی نہ ہوئے تو صفوان بن امیہ کے لیے چار سو (درہم) ہونگے۔" [3]

3. حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں ہے:

'قَالَ رَجُلٌ لِكَرِيِّهِ أُدْخِلْ رِكَابَكَ ، فَإِنْ لَمْ أَرْحَلْ مَعَكَ يَوْمَ كَذَا وَكَذَا فَلَكَ مِائَةُ دِرْهَمٍ فَلَمْ يَخْرُجْ ، فَقَالَ شُرَيْحٌ مَنْ شَرَطَ عَلَى نَفْسِهِ طَائِعًا غَيْرَ مُكْرَهٍ فَهُوَ عَلَيْهِ'

---

[1] نیل الاوطارج 8 ص 205.

[2] مصنف ابن ابی شیبة فی العربان فی البیع .

[3] صحیح البخاری ،فی الخصومات، باب الربط والحبس فی الحرم .

''کہ ایک آدمی نے کرایہ پر دینے والے سے کہا: اپنی سواری تیار رکھنا اگر میں نے فلاں فلاں دن تمھارے ساتھ سفر نہ کیا تو آپ کو سو درہم دوں گا پھر اس نے سفر نہ کیا تو (قاضی) شریح نے کہا جو خوشی سے بغیر کسی جبر کے اپنے اوپر کوئی شرط عائد کرے تو وہ اس کو پوری کرنا ہوگی۔''①

4. حضرت سعید بن میّب اور امام ابن سیرین رحمہما اللہ فرماتے ہیں:

'لَا بَأْسَ إِذَا كَرِهَ السِّلْعَةَ أَنْ يَرُدَّهَا وَيَرُدُّ مَعَهَا شَيْئًا وَقَالَ أَحْمَدُ هَذَا فِي مَعْنَاهُ'

''اس میں کوئی حرج نہیں کہ جب چیز واپس کرے تو اس کے ساتھ کوئی شے واپس کرے۔امام احمد کہتے ہیں یہ صورت بیعانہ کے معنی میں ہی ہے۔''②

فریقین کے دلائل کا تجزیہ

بیعانہ کی شرعی حیثیت کا جائزہ لینے کیلئے درج ذیل نکات کو نگاہ میں رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ صحیح رائے قائم کرنے میں غلطی لگ سکتی ہے۔

- بیعانہ لینے کے بعد مالک پابند ہو جاتا ہے کہ وہ کسی اور کے ساتھ بیع کی بات چیت نہ کرے۔ لہٰذا نہ تو وہ خود بیچنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا خریدار دلچسپی لیتا ہے کیونکہ عموماً اکثر خریداروں کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ فلاں جائیداد کا سودا ہو چکا ہے۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فروخت کنندہ کو اپنا مال اچھی قیمت پر فروخت کرنے کا موقع مل رہا ہو لیکن وہ بیعانہ کی وجہ سے اس فائدہ سے محروم رہے یا بیعانہ کی مدت کے دوران تو کوئی خریدار موجود ہو مگر بعد میں جلد کوئی اور خریدار نہ مل سکے جس کے باعث اسے اپنی چیز کم قیمت پر فروخت کرنی پڑے۔

---

① صحیح بخاری باب ما یجوز من الاشتراط و الثنیا فی الاقرار .

② المغنی فصل فی بیع العربون .

مزید یہ کہ نیا گاہک تلاش کرنے کے لئے از سر نو جدوجہد کرنی پڑتی ہے جس پر بعض اوقات اخراجات بھی آتے ہیں اس لئے بیعانہ کی ضبطی کو مطلق مال ناحق قرار دینا درست نہیں۔

❁ عمرو بن شعیب کی سند سے منقول سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں بیعانہ کی صورت میں خرید وفروخت کی ممانعت آئی ہے محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ یہ روایت مختلف کتب حدیث میں متعدد سندوں سے مروی ہے مگر کوئی سند بھی محدثین کرام کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ چنانچہ علامہ محمد بن اسماعیل الصنعانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'وَلَهُ طُرُقٌ لَا تَخْلُو عَنْ مَقَالٍ'

''اس کی متعدد سندیں ہیں مگر کوئی بھی کلام سے خالی نہیں۔''[1]

❁ چونکہ بیعانہ میں مدت، قیمت اور فروخت کی گئی چیز سمیت سب کچھ معلوم ہوتا ہے نیز سپردگی بھی ممکن ہوتی ہے، لہٰذا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اس میں بے یقینی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ممکن ہے خریدار بیع رد کردے تو اس قسم کا امکان تو خیار شرط وغیرہ میں بھی موجود ہوتا ہے حالانکہ وہ سب کے نزدیک جائز ہے۔

❁ اکثر وبیشتر جب تک بیعانہ دینے والا مکمل ادائیگی نہ کر دے چیز حسب دستور اصل مالک کی ملکیت ہی رہتی ہے، لہذا مانعین کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ یہ اس لئے ناجائز ہے کہ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ ''اگر خریدار بیع پر راضی نہ ہوا تو چیز واپس فروخت کنندہ کو مل جائے گی'' کیونکہ چیز تو پہلے ہی مالک کے قبضہ میں ہوتی ہے۔

❁ زید بن اسلم کی روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ زید بن اسلم رحمہ اللہ تابعی ہیں جو اس روایت کو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کر رہے ہیں۔ جمہور محدثین کے نزدیک ایسی روایت قابل حجت نہیں ہے۔

❁ شارحین حدیث کی رائے میں نافع بن عبدالحارث رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدم رضا کی

---

[1] سبل السلام: ج2، ص 349.

صورت میں صفوان بن امیہ کو جو چار سو درہم دینے کا وعدہ کیا تھا وہ بیعانہ نہیں بلکہ اس عرصہ میں مکان کے استعمال کا کرایہ تھے۔ چنانچہ شارح بخاری علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نافع کا یہ شرط لگانا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ راضی نہ ہوئے تو صفوان کو چار سو درہم دیئے جائیں گے، ہوسکتا ہے انہوں ان دراہم کو حضرت عمر کا جواب آنے تک گھر سے فائدہ حاصل کرنے کا کرایہ قرار دیا ہو۔''①

علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس کا مطلب ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سودے پر راضی نہ ہوئے تو حضرت عمر کی طرف سے جواب آنے تک اس گھر سے فائدہ اٹھانے کے عوض صفوان کو چار سو درہم دیئے جائیں گے۔''②

علامہ شہاب الدین قسطلانی رحمہ اللہ نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے۔③

لیکن جس طرح کرایہ لینے کے باعث مالک پابند ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مکان سے کوئی دوسرا فائدہ نہیں اٹھا سکتا اسی طرح بیعانہ میں بھی مالک اچھی قیمت کا موقع ملنے کے باوجود فائدہ اٹھانے سے محروم رہتا ہے کیونکہ وہ بیعانہ کی وجہ سے چیز کو روکنے کا پابند ہوتا ہے اس لحاظ سے یہ واقعہ بیعانہ سے ملتا جلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام اثرم رحمہ اللہ نے حضرت امام احمد بن حنبل سے پوچھا کہ کیا آپ بھی اس کے قائل ہیں تو انہوں نے فرمایا:

''میں کیا کہوں یہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس کے قائل ہیں۔''④

---

① فتح الباری: ج5، ص95.

② عمدة القاری: ج9، ص151.

③ ارشاد الساری: ج5، ص420.

④ المغنی ج 6، ص331.

❁ قاضی شریح کا فیصلہ اگرچہ اجارہ کے بارہ میں ہے مگر اجارہ بھی بیع کی قسم ہے اور جس طرح سواری بک کرانے والا مالک کو پابند بنا دیتا ہے کہ دوسرے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اسی طرح بیعانہ دینے والا بھی شخص بھی کرتا ہے۔ نیز ان کے الفاظ:

''کہ جو خوشی سے بغیر کسی جبر کے اپنے اوپر کوئی شرط عائد کرے تو وہ اس کو پوری کرنا ہوگی۔''

سے بھی دوسرے گروہ کے موقف کو تقویت پہنچتی ہے۔

❁ حضرت سعید بن مسیّب اور امام ابن سیرین کے قول کا مطلب ہے کہ اگر مشتری کٹوتی کی شرط پر خریدی گئی چیز واپس کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یعنی اس کا تعلق بیعانہ سے نہیں بلکہ بیع کا معاملہ مکمل ہونے کے بعد اس کی واپسی سے ہے جیسا کہ ''واپس کرے'' کے الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے۔ چونکہ بیعانہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ خریدار فروخت کنندہ کو کچھ رقم ادا کرتا ہے اس لئے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس کو بیعانہ سے ملتی جلتی ایک صورت قرار دیا ہے۔[1]

راجح موقف

اس تجزیہ سے صاف واضح ہے کہ بیعانہ کے حق یا مخالفت میں نبی ﷺ سے منقول کوئی روایت بھی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ نافع بن عبدالحارث کے واقعہ، قاضی شریح کے فیصلے، حضرت سعید بن مسیّب اور امام ابن سیرین کے اقوال کی روشنی میں ان حضرات کے نقطۂ نظر پر عمل کی گنجائش نکلتی ہے جو اس کو سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ کی حدیث:

'اَلْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ'

''مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہیں۔''[2]

---

① المغنی فصل فی بیع العربون .

② سنن ابی داؤد : باب فی الصلح.

اور فقہ اسلامی کے اصول ''کہ معاملات کی صرف وہی صورتیں حرام ہیں جن کی حرمت پر کتاب وسنت دلالت کناں ہوں' سے بھی ان حضرات کے موقف کوتقویت ملتی ہے۔تاہم بہتر یہی ہے کہ خریداری کا عمل مکمل نہ ہونے کی صورت میں فروخت کنندہ حقیقی نقصان سے زائد رقم واپس کردے۔حقیقی نقصان سے مراد قیمت کا وہ فرق ہے جو مال دوسری جگہ فروخت کرنے پر سامنے آئے۔کیونکہ وہ شخص اللہ تعالی کو بڑا محبوب ہے جو فروخت شدہ چیز واپس لے لیتا ہے چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللَّهُ عَثْرَتَهُ '

''جو مسلمان کا سودا واپس کرے گا اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی غلطیوں سے درگذر فرمائے گا۔''[1]

---

[1] سنن ابی داؤد باب فی فضل الاقالة .

کمیشن ایجنٹ کے ذریعے خرید وفروخت

عصر حاضر کی معیشت وتجارت میں کمیشن ایجنٹ بڑی اہم حیثیت اختیار کر چکا ہے کیونکہ شہری زندگی میں اثاثہ جات کی خرید وفروخت کے بیشتر معاملات اسی کی وساطت سے تکمیل پذیر ہوتے ہیں، بالخصوص سٹاک مارکیٹ اور کموڈیٹی ایکسچینج میں تو بروکر کی خدمات حاصل کیے بغیر لین دین کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نیز سبزی اور فروٹ منڈیوں میں بھی تمام تر خرید وفروخت اسی طرز پر ہوتی ہے کہ باغات کے مالک وکاشتکار اپنا پھل اور پیداوار براہ راست فروخت کرنے کی بجائے آڑھتیوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ کمیشن ایجنٹس کی اکثریت اس شعبہ کے شرعی احکام سے بے بہرہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے کئی خلاف شریعت امور بھی اس شعبے کا لازمی عنصر بن چکے ہیں اور بعض اوقات کمیشن ایجنٹ اور فروخت کنندہ یا کمیشن ایجنٹ اور خریدار کے درمیان سنگین قسم کے تنازعات بھی جنم لیتے ہیں، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع سے متعلق ضروری مسائل واضح اور عام فہم انداز میں بیان کر دیئے جائیں تاکہ ان پر عمل کرکے خرید وفروخت کے معاملات میں شریعت کی خلاف ورزی اور باہمی اختلافات سے بچا جا سکے۔

کمیشن ایجنٹ کا مطلب

کمیشن ایجنٹ سے مراد وہ شخص ہے جو فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان واسطہ بن کر معاملہ طے کرائے اور اپنی اس محنت کا معاوضہ وصول کرے۔ اگرچہ کاروبار کی نوعیت کے اعتبار سے اس واسطے کیلئے مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں مثلا سبزی وفروٹ منڈی میں آڑھتی، منڈی مویشیاں میں دلال، رئیل اسٹیٹ کے کاروبار میں ڈیلر، سٹاک اور کموڈیٹی ایکسچینج میں بروکر

کہا جاتا ہے لیکن ان سب کا مدلول ایک ہی شخص ہے کہ جو خرید وفروخت میں بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ بنے۔

عربی میں اس کیلئے متعدد الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن میں سب سے زیادہ معروف لفظ سمسار ہے جو اصل میں فارسی زبان کا لفظ ہے جس کو عربی شکل دے دی گئی ہے۔ چنانچہ لغت کی مشہور کتاب المعجم الوسیط میں ہے:

'(السمسار) : الوسيط بين البائع والمشتري لتسهيل الصفقة.مسمار الارض العالم بها (جمع) سماسرة (فارسي معرب)'

''سمسار وہ شخص ہے جو سودا آسان بنانے کیلئے بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ ہو۔ ماہر ارضیات کو مسمار الارض کہتے ہیں۔ اس کی جمع سماسرہ آتی ہے۔ یہ فارسی لفظ ہے جس کو عربی میں ڈھالا گیا ہے۔''

علمائے حدیث وفقہ کے نزدیک بھی سمسار کی یہی تعریف ہے۔ چنانچہ علامہ احمد عبدالرحمان البنا رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''کہ سمسار (کمیشن ایجنٹ) وہ ہے جو دوسرے کیلئے خرید وفروخت کرے اس طرح کہ معاوضہ لے کر بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ کی حیثیت سے داخل ہو کر بیع مکمل کرائے۔''[1]

عہد رسالت میں کاروباری طبقہ کیلئے بھی سماسرہ یعنی بروکرز کا لفظ استعمال ہوتا تھا مگر آنحضور ﷺ نے اس کی جگہ ان لوگوں کیلئے تاجر کی اصطلاح متعارف کرائی جیسا کہ سنن اربعہ، مسند امام احمد بن حنبل، مستدرک حاکم اور سنن کبری بیہقی میں مروی ہے:

عَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِي غَرَزَةَ قَالَ كُنَّا فِي عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ نُسَمَّى السَّمَاسِرَةَ فَمَرَّ بِنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَسَمَّانَا بِاسْمٍ هُوَ أَحْسَنُ مِنْهُ فَقَالَ

[1] الفتح الرباني بترتيب مسند الامام احمد بن حنبل الشيباني 15 / 15.

یَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ إِنَّ الْبَیْعَ یَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلِفُ فَشُوبُوهُ بِالصَّدَقَةِ '

''حضرت قیس بن ابی غرزہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہمیں سماسرہ (بروکرز) کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گذرے تو آپ نے ہمارا اس سے اچھا نام رکھا۔ آپ نے فرمایا: اے تاجروں کی جماعت بلاشبہ خرید وفروخت میں لغو گفتگو اور قسمیں بھی شامل ہوتی ہیں لہذا تم اس میں صدقہ ملا لیا کرو۔''[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کاروباری افراد کیلئے بروکرز کی بجائے تاجر کا لفظ کیوں پسند فرمایا، علماء نے اس کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ بروکر اور تاجر میں فرق ہے۔ وہ یہ کہ بروکر محض فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان واسطہ ہوتا ہے، نفع ونقصان کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی جبکہ کاروبار میں نقصان کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اور آپ نے جن لوگوں کو بروکرز کی بجائے تُجّار کہہ کر پکارا وہ صرف بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ نہ تھے بلکہ کاروبار کرتے تھے اس لئے آپ نے انہیں یہ لقب عطا فرمایا۔

کمیشن ایجنٹ کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ وہ قابل اعتماد اور صادق وامین ہونے کے ساتھ ساتھ اس شعبہ میں مکمل مہارت بھی رکھتا ہو کیونکہ لوگ انہی اوصاف کو مدنظر رکھ کر اپنی گراں قدر جائیدادوں کی خرید وفروخت کیلئے ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں لہٰذا خریدار کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا اور چیز کو اس کی مارکیٹ قیمت پر بیچنا کمیشن ایجنٹ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ علاوہ ازیں حکومت وقت کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسا ضابطہ اخلاق وضع کرے جس کی پابندی ہر کمیشن ایجنٹ پر لازم ہو اور ملک کے تمام کمیشن ایجنٹس کا پورا ریکارڈ حکومت کے پاس موجود ہو تا کہ جائیداد کی خرید وفروخت کے معاملات میں دھوکہ دہی کا سد باب کیا جا سکے اور فراڈ کی صورت میں

---

[1] سنن ابی داؤد : کتاب البیوع ،باب فی التجارة یخالطها الحلف واللغو.

ایجنٹ کو بھی قانون کی گرفت میں لایا جا سکے۔

کمیشن پر خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سرخیل محدثین امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری شریف میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ کمیشن لے کر خرید و فروخت کرانی جائز ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں۔

1. حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

'نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُتَلَقَّى الرُّكْبَانُ ، وَلَا يَبِيعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ قُلْتُ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ مَا قَوْلُهُ لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ قَالَ لَا يَكُونُ لَهُ سِمْسَارًا'

''رسول اللہ ﷺ نے منڈی سے باہر جا کر تجارتی قافلوں کو ملنے سے اور اس بات سے منع کیا کہ کوئی شہری کسی صحراء نشین (کے سامان) کی بیع کرائے۔ حضرت طاؤس کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے عبداللہ بن عباس آپ ﷺ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے کہا اس کا معنی ہے کہ اس کا دلال نہ بنے۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کمیشن پر لین دین کی صرف ایک خاص صورت سے منع کیا ہے۔ وہ مخصوص صورت یہ ہے کہ شہری صحراء نشین کو کمیشن پر خرید و فروخت کرائے یعنی جب آبادی سے دور جنگلات میں رہنے والے خریداری یا اپنا مال فروخت کرنے کیلئے شہر میں آئیں تو انہیں براہ راست خرید و فروخت کرنے دی جائے کیونکہ یہ لوگ عموماً انتہائی ضرورت کے وقت اور محدود پیمانے پر ہی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کے لوگوں سے کمیشن کی وصولی قرین انصاف نہیں ہے۔ اس حدیث مبارک سے یہ عیاں ہے کہ شہروں کے رہائشی ایک دوسرے کے ساتھ کمیشن کا لین دین کر سکتے ہیں۔ اسی لئے فقیہ امت امام بخاری رحمہ اللہ

---

[1] صحیح البخاری : کتاب الاجارات ،باب اجر السمسرة

نے اس پر کمیشن کے جواز کا عنوان قائم کیا ہے اور ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اس کو جائز نہیں سمجھتے۔ واضح رہے کہ دیہاتی شرعاً صحراء نشین نہیں ہیں، صحراء نشین صرف وہ ہیں جو جنگلات میں رہتے ہوں۔

2. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'اَلْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ'

''مسلمان باہمی شرائط کے پابند ہیں۔''[1]

اس حدیث میں یہ قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے کہ اگر خرید وفروخت کے معاملے میں ایسی شرط لگائی جائے جو عقد بیع کے منافی نہ ہو اور نہ ہی شریعت نے اسے باطل اور ناجائز قرار دیا ہو تو اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ چونکہ کمیشن کی شرط نہ تو عقد بیع کے منافی ہے اور نہ ہی شریعت نے اسے باطل قرار دیا ہے لہذا اس کا پورا کرنا واجب ہے۔

3. حضرت عطاء سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں:

'أنه كان لا يرى بأسا أن يعطي الرجل الرجل الثوب فيقول بعه بكذا و كذا فما ازددت فلك'

''کہ وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایک شخص دوسرے کو کپڑا دے کر یوں کہے کہ اسے اتنے اتنے میں بیچ دو، اس سے جتنے زائد ہوں گے وہ تمہارے ہیں۔''[2]

4. علاوہ ازیں حضرات تابعین میں سے امام ابن سیرین، عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعی اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہم بھی یہی کہتے ہیں کہ کمیشن کا لین دین جائز ہے۔[3]

درج بالا روایات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ کمیشن وصول کر کے خرید وفروخت کرانے

---

[1] سنن ابی داؤد باب فی الصلح .

[2] مصنف ابن ابی شیبة : فی الرجل یدفع إلی الرجل الثوب فیقول بعه فما ازددت فلك .

[3] صحیح بخاری باب اجر السمسرة.

میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نیز شریعت کے اصول ''کہ جن معاملات سے منع نہیں کیا گیا وہ جائز ہیں'' کا بھی یہ تقاضا ہے کہ کمیشن جائز ہو کیونکہ قرآن وحدیث سے اس کی ممانعت ثابت نہیں ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ دلالی کی اجرت کو جائز نہیں سمجھتے۔[1]

تاہم متاخرین حنفیہ اسے جائز ہی قرار دیتے ہیں جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی نے وضاحت کی ہے:

'وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال أرجو أنه لا بأس به'

''حاوی میں ہے کہ محمد بن سلمہ سے بروکر کی کمیشن کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا میں امید رکھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔''[2]

ان کے علاوہ علامہ ابن نجیم حنفی نے بھی اپنی کتاب ''الأشباہ والنظائر'' میں اسے لوگوں کی ضرورت ہونے کی بنا پر جائز قرار دیا ہے۔[3]

کمیشن پر خرید وفروخت کی فقہی نوعیت

بعض فقہاء ومحدثین کرام کمیشن پر خرید وفروخت کے مسائل اجارہ یعنی کرایہ داری کے معاملات اور بعض جُعالہ کے ضمن میں ذکر کرتے ہیں جبکہ بعض اسے وکالہ (Agency) بھی کہتے ہیں۔ صحیح بخاری میں بھی اس کا تذکرہ اجارہ کے عنوان میں ہوا ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر اجارہ، جعالہ اور وکالہ تینوں جائز ہیں اس لئے اس اختلاف کی کمیشن کے جواز پر زد نہیں پڑتی۔ اجارہ اور ایجنسی کی حقیقت تو معروف ہے البتہ جعالہ قدرے غیر معروف اصطلاح ہے اس لئے یہاں اس کا

---

[1] عمدۃ القاری: ج8، ص623.

[2] حاشیۃ رد المحتار: ج6، ص63.

[3] الأشباہ والنظائر ص270.

مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

جعالہ

جعالہ کے لغوی معنی ہے وہ چیز جو کسی شخص کو کوئی کام کرنے کے بدلے میں دی جائے جبکہ اس کی شرعی تعریف یہ ہے:

''جعالہ ایک ایسا عقد ہے جس میں ایک فریق یہ کہتا ہے کہ جو شخص اس مدت میں یا مدت کا تذکرہ کئے بغیر یہ کہے کہ جو شخص مجھے (اس کام کا) یہ نتیجہ دے گا میں اس کو اتنا مال دوں گا۔'' [1]

مثلاً یوں کہا جائے کہ جو شخص میری فلاں گمشدہ چیز تلاش کر کے دے گا میں اس کو اتنا انعام دوں گا یا جو کمپنی کسی جگہ سے تیل تلاش کرے گی یا جو شخص یا ادارہ فلاں منصوبے کی فزیبلٹی رپورٹ تیار کر کے دے گا اس کو اتنا معاوضہ دیا جائے گا۔ اب جو شخص بھی وہ چیز تلاش کر کے لائے گا یا جو کمپنی بھی تیل تلاش کرنے میں کامیاب ہوگی یا جو شخص بھی رپورٹ تیار کر کے دے گا وہ اس مال کا مستحق ہو جائے گا۔ جعالہ ایک مستقل عقد ہے جو درج ذیل امور میں اجارہ سے مختلف ہے۔

1. جعالہ میں عامل کا تعین شرط نہیں کہ فلاں شخص ہی یہ کام کرے بلکہ جو شخص بھی کام کر دے وہ اس مال کا مستحق ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس اجارہ ہمیشہ متعین شخص کے ساتھ ہوتا ہے۔
2. اجارہ میں مدت متعین ہوتی ہے جبکہ جعالہ میں مدت کا تعین شرط نہیں۔ لیکن اگر کام کرانے والے نے یہ تصریح کر دی ہو کہ یہ کام فلاں تاریخ تک کرنا ضروری ہے تو اس صورت میں مدت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔
3. جعالہ میں یہ ضروری نہیں کہ کام کرنے والے نے اس کی ذمہ داری قبول بھی کی ہو جبکہ اجارہ میں یہ لازم ہے۔

---

[1] المعايير الشرعية ص 260.

4. اجارہ عقد لازم ہے اور جعالہ غیر لازم یعنی اجارہ شروع ہونے کے بعد کوئی فریق اسے یکطرفہ ختم نہیں کر سکتا جبکہ جعالہ ختم کرنے کیلئے کام کروانے والے کو مطلع کرنا ضروری نہیں ہے۔

جعالہ کے جواز کی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت ہے:

﴿قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ﴾

''انہوں نے کہا کہ ہم بادشاہ کا پیمانہ گم پاتے ہیں اور جو کوئی اسے لائے گا اس کو ایک اونٹ کے بوجھ اٹھانے کے برابر غلہ ملے گا اور اس کا ضامن میں ہوں۔''[1]

سنت سے اس کے جواز کی دلیل نبی کریم ﷺ کی وہ حدیث مبارک ہے جو آپ نے غزوہ حنین کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی:

'مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا لَهُ عَلَيْهِ بَيِّنَةٌ فَلَهُ سَلَبُهُ'

''جس نے کسی کافر کو قتل کیا اور اس کے پاس اس کی دلیل ہوئی تو اس کافر کا سامان اس کو ملے گا۔''[2]

جعالہ کے جواز میں یہ حکمت اور مصلحت پنہاں ہے کہ بعض اوقات کام مجہول ہونے کی وجہ سے اجارہ ممکن نہیں ہوتا اور کوئی ایسا شخص بھی نہیں ملتا جو بلا معاوضہ یہ کام کرنے کیلئے تیار ہو، لہذا شریعت نے اسے لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر جائز قرار دیا ہے۔

چونکہ جعالہ کا مقصد لوگوں کو کسی کام کی ترغیب دینا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ کام کرنے والوں کو اس کے بدلہ میں دی جانے والی اجرت معلوم ہو کیونکہ اس کے بغیر کوئی شخص کام میں دلچسپی نہیں لے گا۔ البتہ بعض صورتوں میں اجرت کی مقدار کا تعین ضروری نہیں ہوتا جیسے فوج کا

---

[1] یوسف:72.

[2] صحیح البخاری: باب من لم یخمس الاسلاب۔ صحیح مسلم: باب اسْتِحْقَاقِ الْقَاتِلِ سَلَبَ الْقَتِيلِ.

کمانڈر یہ اعلان کرے کہ جوشخص دشمن فوج کے کسی سپاہی کو قتل کرے گا تو اس کا ساز وسامان قتل کرنے والے کو دیا جائے گا۔ یہ جعالہ ہے جس میں اجرت کی مقدار مجہول ہے مگر یہ جائز ہے جیسا کہ مذکورہ حدیث سے واضح ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں جعالہ کی مندرجہ ذیل صورتیں جائز تصور ہوں گی۔

- حکومت کا یہ اعلان کرنا کہ جو کمپنی کسی جگہ سے تیل تلاش کرے گی تو اسے حاصل ہونے والے تیل کی اتنے فیصد آمدنی دی جائے گی۔
- مالک مکان کا یہ کہنا تم میرا یہ مکان فروخت کرو اور اگر تم کامیاب ہو گے تو تمہیں اس کی قیمت کا اتنے فیصد دے جائے گا۔
- باغ کے مالک کا یہ کہنا کہ تم میرے باغ کا پھل اتارو، جتنا اتارو گے اس میں سے اتنا آپ کو ملے گا۔ کیونکہ ان صورتوں میں نزاع کا اندیشہ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جعالہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس عمل پر جعالہ کیا جا رہا ہو وہ اس کام کرنے والے کے فرائض میں شامل نہ ہو۔ مثلا ایک شخص کی گاڑی چوری ہوگئی تو وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ جو میری اس گاڑی کے بارے میں اطلاع دے گا میں اس کو ایک لاکھ روپیہ انعام دوں گا۔ اب چور یہ اعلان سن کر گاڑی لے کر مالک کے پاس پہنچ جائے تو وہ انعام کا مستحق نہیں ہوگا کیونکہ گاڑی واپس کرنا اس کی شرعی ذمہ داری ہے۔ نیز جعالہ میں کام کرنے والا اپنی اجرت کا اسی صورت مستحق قرار پاتا ہے جب وہ کام مکمل کر لے اور اگر کام کی تکمیل میں کامیاب نہ سکے تو وہ اجرت سے محروم رہتا ہے۔

فیصد کے حساب سے کمیشن لینا

کمیشن متعین رقم کی صورت میں بھی وصول کی جاسکتی ہے مثلا یہ طے کرلیا جائے کہ میں یہ سودا کرانے کے عوض دس ہزار روپے وصول کروں گا اور فیصد کے حساب سے بھی لینا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے شاگرد اسحاق بن ابراہیم ھانی کہتے ہیں:

"کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جو کسی شخص کے ساتھ اس طرح معاملہ طے کرتا ہے کہ وہ اسے ہر کپڑے کے بدلے جو وہ خرید ے گا نصف درہم یا اس سے زائد یا اس سے کم دے گا تو انہوں نے فرمایا میں اسے پسند نہیں کرتا اور یہ صورت نبی ﷺ کی اس حدیث جیسی ہے کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے نبی میرے ساتھ بیع میں دھوکہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہر سو درہم کے بدلے ایک طے شدہ یعنی فیصد کے حساب سے معاوضہ دے تو انہوں نے کہا یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔"[1]

بادیٔ النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل صرف فیصد فارمولے کے تحت کمیشن لینے کے قائل ہیں، متعین رقم کی صورت میں کمیشن لینا جائز نہیں سمجھتے لیکن امر واقع میں ایسا نہیں ہے۔ متعین رقم کی صورت میں کمیشن تب ہی ناپسندیدہ ہے جب چیز کی صفات معلوم نہ ہوں یا اس کی قیمت کا اندازہ نہ ہو لیکن اگر صفات معلوم ہوں یا قیمت کا اندازہ ہو تو پھر امام موصوف کے نزدیک بھی یہ جائز ہے جیسا کہ معروف حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ بروکر کی اجرت کے ضمن میں رقمطراز ہیں:

"اگر کوئی اس طرح کام کرنے کا کہے کہ وقت کی قید نہ ہو اور ہر ہزار درہم کے بدلے کچھ معلوم معاوضہ متعین کرے تو یہ بھی جائز ہے اور اگر یہ کہے تو جب بھی کوئی کپڑا خریدے گا تو تجھے ایک درہم اجرت ملے گی اور کپڑوں کی صفات معلوم ہوں یا قیمت کا اندازہ ہو تو یہ جائز ہے اور اگر ایسا نہ ہو یعنی صفات معلوم نہ ہوں یا قیمت کا اندازہ نہ ہو تو امام احمد کے کلام سے یہ ظاہر ہے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ قیمتیں مختلف ہونے سے کپڑے مختلف ہو جاتے ہیں اور کپڑے مختلف ہونے سے اجرت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔"[2]

---

[1] مسائل الامام احمد بن حنبل برواية ابن هانی : ج 2 ،ص 13، 32.

[2] المغنی ج 8 ، ص 42.

اس سے معلوم ہوا کہ کمیشن کے دونوں طریقے صحیح ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک کمیشن کو قیمت فروخت کے ساتھ مربوط کرنا یعنی یہ کہنا کہ میں اس چیز کی قیمت فروخت کا ایک فیصد یا دو فیصد کمیشن لوں گا جیسا کہ آج کل رواج ہے درست نہیں۔ ایک تو اس لئے کہ اس صورت میں کمیشن کی رقم متعین نہیں ہوتی بلکہ مبہم رہتی ہے جبکہ شرعاً کمیشن کی رقم متعین ہونی چاہیے۔

اور دوسرا اس وجہ سے کہ کمیشن دراصل ایجنٹ کی محنت کا معاوضہ ہے۔ اب چیز دس لاکھ میں فروخت ہو یا گیارہ لاکھ میں، دونوں صورتوں میں محنت مساوی ہے قیمت کی کمی بیشی سے کم وزائد نہیں ہوئی، لہٰذا قیمت فروخت کی بنیاد پر کمیشن لینا جائز نہیں لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث یہ رائے صائب نہیں ہے۔

1. کام کرنے والے کی محنت کا معاوضہ پیداوار کی فیصد کے مطابق مقرر کرنا سنت نبوی سے ثابت ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کو خیبر کے باغات اور زمینیں اس شرط پر دی تھیں کہ وہ ان میں محنت کریں گے اور اس کے بدلے ان کو پیداوار کا نصف ملے گا جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما منقول ہے:

'أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَامَلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ'

''نبی ﷺ نے اہل خیبر سے اناج اور پھلوں کی نصف پیداوار پر معاملہ کیا تھا۔''[1]

اہل خیبر کو اناج اور پھلوں کی پیداوار کی مقدار کا قطعی علم نہ تھا کیونکہ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے البتہ انہیں اس مقدار سے اپنے حصے کا علم ضرور تھا۔ کمیشن ایجنٹ کو فیصد کے اعتبار سے معاوضہ دینا اس سے ملتا جلتا مسئلہ ہے اس لئے یہ حدیث اس امر کی مضبوط دلیل ہے کہ قیمت کو معیار بنا کر معاوضہ طے کیا جا سکتا ہے۔

2. بیع ہمیشہ معلوم قیمت کے بدلے ہوتی ہے جس کی بنا پر کمیشن بھی معلوم ہوتی ہے اور اس میں

[1] صحیح البخاری باب المزارعة بالشطر و نحوه ۔صحیح مسلم باب المساقاة والمعاملة .

کسی قسم کے نزاع کا خطرہ بھی نہیں ہوتا لہٰذا یہ کہنا کہ قیمت فروخت کی فیصد کے اعتبار سے کمیشن طے کرنے کی صورت میں کمیشن کی رقم مبہم رہتی ہے درست نہیں۔

3. یہ مسلمہ اصول ہے کہ اجرت ہمیشہ کام کی نوعیت کے مطابق لی جاتی ہے نہ کہ محنت کی مقدار کے مطابق۔ نیز کم قیمت چیز کا گاہک آسانی سے مل جاتا ہے جبکہ گراں قیمت چیز کی فروخت کیلئے زیادہ دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے اور ذمہ داری بھی زیادہ ہوتی ہے۔

کمیشن کی شرح متعین نہ کرنا

بعض اوقات فروخت کار کمیشن کی کوئی خاص رقم یا شرح طے کرنے کی بجائے یہ کہہ دیتا ہے کہ آپ مجھے اس پلاٹ کے اتنے پیسے دے دیں، اس سے جتنے زائد ہوں گے وہ آپ کے ہیں۔ اکثر اہل علم کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں کمیشن واضح نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے پلاٹ طلب کی گئی قیمت سے زائد پر فروخت نہ ہو جس کی وجہ سے ایجنٹ اپنی محنت کے صلہ سے محروم رہے جبکہ دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور تابعین میں سے امام زہری، حضرت قتادہ، ایوب سختیانی اور امام ابن سیرین رحمہم اللہ کی رائے میں اس طرح معاملہ کرنا صحیح ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

'وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا بَأْسَ أَنْ يَقُولَ بِعْ هَذَا الثَّوْبَ فَمَا زَادَ عَلَى كَذَا وَكَذَا فَهُوَ لَكَ'

''ابن عباس نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں کہ انسان یہ کہے کہ یہ کپڑا بیچ دو جو اس سے زائد ہوں گے وہ آپ کے ہوں گے۔''[1]

مشہور محدث امام عبدالرزاق رحمہ اللہ اپنی کتاب مصنف میں نقل کرتے ہیں:

'أخبرنا معمر عن الزهري وقتادة وأيوب وابن سيرين كانوا لا يرون

---

[1] صحيح البخاري باب اجر السمسرة.

ببیع القیمة بأسا أن یقول بع هذا بکذا و کذا فما زاد فلك'

''ہمیں معمر نے زہری، قتادہ، ایوب اور ابن سیرین سے بیان کیا کہ وہ بیع القیمہ یعنی یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ اس چیز کو اتنے اتنے میں بیچ دو جو زائد ہوں گے وہ آپ کے ہیں۔''[1]

چونکہ اس صورت میں یہ بھی احتمال ہے کہ ایجنٹ مالک کی سوچ سے بہت زیادہ قیمت پر فروخت کرنے میں کامیاب ہو جائے جس کی وجہ سے ایجنٹ اور مالک کے مابین کشیدگی اور بدمزگی پیدا ہو جیسا کہ مشاہدہ ہے یا طلب کی گئی قیمت پر ہی فروخت ہو سکے اور ایجنٹ کو کچھ بھی نہ ملے اس لئے بعض علماء کے خیال میں پہلی رائے ہی راجح ہے۔

فائدہ: اگر یوں کہا جائے کہ آپ مجھے اتنے پیسے دے دیں اس سے جو زائد ہوں گے وہ میرے اور آپ کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوں گے تو اس میں بھی وہی اختلاف ہے جو اوپر ذکر ہوا۔

دوطرفہ کمیشن

کمیشن ایجنٹ کو ادائیگی کس کی ذمہ داری ہے؟ اس بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کا فیصلہ رواج اور باہمی شرائط کے مطابق ہوگا۔ اگر صرف فروخت کار سے لینے کی شرط طے کی گئی ہو یا رواج ہی یہ ہو تو ایسی صورت میں صرف فروخت کار سے کمیشن لی جائے گی اور اگر فقط مشتری سے لینے کی شرط طے ہو یا رواج ہو تو فقط مشتری ادا کرے گا اور اگر دونوں سے لینے کا رواج ہو یا شرط ہو تو دونوں ادا کریں گے اور اگر ایسی کوئی شرط یا رواج نہ ہو تو صرف فروخت کار ادا کرے گا۔ چنانچہ ممتاز مالکی فقیہ علامہ محمد عرفہ دسوقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'وَاعْلَمْ أَنَّ الْأَصْلَ فِي جُعْلِ السِّمْسَارِ أَنْ يَكُونَ عَلَى الْبَائِعِ عِلْمِ

---

[1] باب الرجل یقول بع هذا بکذا فما زاد فلك.

الشَّرطِ ، أَوِ العُرفِ'

''جان لو! بلا شبہ بروکر کی اجرت کا اصول یہ ہے کہ جب شرط یا رواج نہ ہوتو وہ فروخت کنندہ کے ذمہ ہو۔''[1]

کیونکہ ایسی صورت میں کمیشن کی رقم قیمت میں شامل ہوگی لہٰذا اس کی ادائیگی فروخت کنندہ کی ذمہ داری ہوگی۔ بعض حضرات کے خیال میں ایک ہی ایجنٹ دونوں طرف سے کمیشن نہیں لے سکتا لیکن یہ رائے درست نہیں۔ اگر کوئی ایجنٹ خریدار اور فروخت کنندہ دونوں کی طرف سے خدمات انجام دیتا ہےتو وہ دونوں طرف سے کمیشن لے سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قرض کے بدلے زائد کمیشن لینا

بعض بیوپاری اپنی طرف سے بہت کم سرمایہ لگاتے ہیں اور زیادہ سرمایہ آڑھتی سے قرض لے کر کاروبار کرتے ہیں۔ آڑھتی اس شرط پر قرض دیتا ہے کہ وہ اپنا خریدا ہوا مال اسی کے پاس لاکر فروخت کریں گے اور اس رقم سے اپنا قرض بھی ادا کریں گے۔ یہ حرام ہے کیونکہ حدیث میں ایسے قرض کی ممانعت آئی ہے جو فائدے کا باعث بنے۔ اور عموما اس قسم کے بیوپاریوں سے دوسروں کی نسبت کمیشن بھی زائد لی جاتی ہے جو کہ سود کی تعریف میں آتی ہے۔ بعض حضرات اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ آڑھتی کی طرف سے دی گئی رقم قرض نہیں بلکہ پیشگی ہوتی ہے، جس طرح کہ بیع سلم میں پیشگی قیمت ادا کی جاتی ہے مگر یہ تاویل باطل ہے کیونکہ یہ رقم نہ تو بیع کی بنیاد پر لی جاتی ہے اور نہ ہی اس میں بیع سلم کی شرائط ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔

کمیشن ایجنٹ کی حق تلفی

یہ بات صحیح ہے کہ شرعا انسان اس امر کا پابند نہیں ہے کہ وہ اپنی جائیداد کا لین دین ایجنٹ کی وساطت سے ہی کرے بلکہ وہ براہ راست بھی سودا کرسکتا ہے لیکن ایجنٹ کے توسط گاہک تلاش کرنے یا

[1] حاشية الدسوقي على الشرح الكبير، في احكام الخيار .

جائیداد دیکھنے اور ابتدائی بات چیت کے بعد اس سے ماوراء خود ہی سودا طے کر لینا تا کہ کمیشن بچائی جا سکے درست نہیں ہے کیونکہ اس کا محرک ایجنٹ کو اس کے معاوضہ سے محروم رکھنا ہے جو کہ شرعی اعتبار سے جائز نہیں ہے۔اسی طرح بعض خریدار ایک ایجنٹ کے توسط سے جائیداد دیکھ کر دوسرے ایجنٹ کے ذریعے سودا طے کر لیتے ہیں یہ بھی غلط ہے۔ہاں اگر زیادہ قیمت پر بیچنے کے جذبہ سے ایسا کیا جائے خواہ بعد میں کم قیمت پر ہی فروخت ہو سکے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔چنانچہ ابوالعباس الابیانی رحمہ اللہ (متوفی 352ہجری) لکھتے ہیں:

''اگر اس دلال کے ہاتھ میں کپڑا ایک خاص قیمت پر ٹھہر چکا ہو یعنی اس سے زیادہ قیمت نہ مل رہی ہو اس پر کپڑے کا مالک بیچنے سے انکار کر دے اور دلال سے کپڑا لے کر خود خریدار کے پاس چلا جائے اور اس کو اسی قیمت میں بیچ دے تو اس نے دلال کا حق باطل کرنا چاہا حالانکہ وہ واجب ہو چکا تھا۔اور اگر محض زیادہ قیمت کی امید پر لے کر دوسرے کو دے اور وہ زائد یا کم یا اتنی قیمت پر ہی بیچ دے تو کمیشن دوسرے کو ملے گی پہلے کو کچھ نہیں ملے گا۔''[1]

تنسیخ معاہدہ بیع اور کمیشن

بعض اوقات کمیشن ایجنٹ کی مدد سے فریقین کے مابین بیع کا معاہدہ طے پا جاتا ہے اور فروخت کنندہ بیعانہ کی رقم بھی وصول پا لیتا ہے لیکن خریدار یا فروخت کنندہ کے حالات یا چیز میں کسی نقص کے انکشاف کی وجہ سے بیع پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتی بلکہ معاہدہِ بیع منسوخ کرنا پڑتا ہے۔ایسی صورت میں کمیشن ایجنٹ کی اجرت کا کیا حکم ہے۔کیا ایجنٹ کی خدمات حاصل کرنے والے فریق کے ذمے اس کی ادائیگی واجب ہوگی یا نہیں؟اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اگر تو معاہدہ خریدی گئی چیز میں کوئی نقص واضح ہونے کی وجہ سے منسوخ ہوا ہو تو ایسی صورت

---

[1] مسائل السماسرة ، ص:40.

میں ایجنٹ کمیشن کا مستحق نہیں ہوگا کیونکہ چیز کی مکمل چھان بین اس کی ذمہ داری تھی جو اس نے کما حقہ پوری نہیں کی لہٰذا یہ اجرت کا حق دار بھی نہیں ہوگا۔ امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ جب سامان میں نقص واضح ہونے کی بنا پر بیع ختم کر دی جائے اور سامان کا مالک دلال کو دی گئی کمیشن واپس لینا چاہے اور وہ واپس کرنے پر آمادہ نہ ہو تو امام مالک نے جواب دیا:

''میرے خیال میں کمیشن واپس ہونی چاہیے۔''[1]

اسی طرح اگر دوسرے فریق کے انکار کی وجہ سے سودا مکمل نہ ہو سکے تو پھر بھی ایجنٹ کمیشن کا تقاضا نہیں کر سکتا کیونکہ سودا طے کرانا اس کی ذمہ داری تھی جو وہ دوسرے فریق کے رویے کے باعث پوری نہیں کی جا سکی لہٰذا جو فریق اپنی بات پر قائم ہو ایجنٹ کا اس سے کمیشن کا مطالبہ کرنا قرین انصاف نہیں۔

لیکن اگر ایجنٹ کی خدمات حاصل کرنے والا اپنی ذاتی وجوہ کی بنا پر خود ہی سودا ختم کرنا چاہتا ہو تو اس صورت میں اس کے ذمے کمیشن کی ادائیگی واجب ہوگی کیونکہ ایجنٹ اپنا کام کر چکا ہے جس کا اسے معاوضہ ملنا چاہیے۔

---

[1] المدونة، عهدة بيع المأمور ببيع السلعة.

اجارہ کے اصول اور اسلامی وروائتی بینک

آج کل اسلامی بینکاری کا بڑا غلغلہ ہے۔پاکستان سمیت دنیا بھر میں اسلام کے نام پر بینک اور مالیاتی ادارے قائم کئے جارہے ہیں۔یہ بینک اور مالیاتی ادارے جن شرعی اصطلاحات کے نام پر اپنی مصنوعات متعارف کرارہے ہیں ان میں اجارہ (Ijarah) بھی شامل ہے بلکہ اسلامی بینکاری کے سیاق وسباق میں اس کا تذکرہ بکثرت ہوتا رہتا ہے، جیسے آٹو اجارہ، پلانٹ اینڈ مشینری اجارہ وغیرہ ،جبکہ روائتی بینک بھی اس کے استعمال میں پیش پیش ہیں بلکہ بینکاری کے ساتھ اس کا تعارف روائتی بینکوں کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہے اسلامی بینکوں نے یہ تصورانہی سے لیا ہے۔

بلاشبہ اجارہ اسلامی معیشت کی معروف اصطلاح ہے جس سے دین کا ہر طالب علم آشنا ہے لیکن محض اجارے کا لفظ دیکھ کر کسی معاملے کو اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک وہ پوری طرح شرعی اصول سے ہم آہنگ نہ ہو۔اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو اجارہ کے شرعی احکام سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ خود فیصلہ کرسکیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔

اِجارہ کی حقیقت

لغوی اعتبار سے اِجارہ کا لفظ ''اجر'' سے مأخوذ ہے جس کے معنی ہے ''معاوضہ''۔ماہرین شریعت کے نزدیک جب ایک طرف کسی چیز کا حق استعمال (Usufruct) یا کسی شخص کی محنت ہو اور دوسری جانب اس کا معاوضہ تو وہ معاملہ اجارہ کہلاتا ہے۔چنانچہ اجارہ کی شرعی تعریف یوں کی جاتی ہے۔

'ھی عقد علی منفعة مباحة معلومة من عین معینة أو موصوفة

فی الذمۃ مدۃ معلومۃ أو عمل معلوم بعوض معلوم '

''طے شدہ معاوضے کے بدلے کسی معین چیز یا ایسی (غیر معین) چیز جس کے اوصاف بیان کر دیے گئے ہوں کے جائز اور معلوم حق استعمال کو متعین مدت کے لیے دینے یا طے شدہ اجرت کے عوض کوئی معلوم کام کرانے کا معاہدہ اجارہ ہے۔''[1]

درج بالا تعریف کی روشنی میں ثابت ہوا کہ اسلامی قانون معیشت میں اجارہ کی اصطلاح دو مختلف صورتوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

1. متعین مدت کے لیے اپنے کسی اثاثے یا جائیداد کا حق استعمال دوسرے شخص کی طرف منتقل کرنا اور اس کے بدلے کرایہ وصول پانا۔ اس کو اردو میں پٹہ داری، انگریزی میں Lease اور عربی میں 'اِجارۃُ الْاَعیان' کہتے ہیں۔ حق استعمال (Usufruct) کے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اجارہ میں صرف فائدہ حاصل کرنے کا حق فروخت کیا جاتا ہے، خود چیز مالک یعنی اجارہ پر دینے والے شخص کی ملکیت میں ہی رہتی ہے۔

2. اجرت پر کوئی کام کرنا یا کرانا، چاہے وہ کام جسمانی ہو یا ذہنی۔ چنانچہ معاوضے پر کسی مزدور، ڈاکٹر، انجینئر یا وکیل کی خدمات حاصل کرنا سب اجارہ میں داخل ہے۔ اس کو انگریزی میں Employment اور عربی میں اجارۃ الاشخاص کہتے ہیں۔

قرآن وسنت کی روشنی میں اجارہ کی یہ دونوں صورتیں جائز ہیں اور زمانہ قدیم سے لے کر آج تک دنیا میں رائج چلی آ رہی ہیں۔

اجارہ اور بیع میں فرق

اصطلاح میں تو اجارہ بیع کی ایک قسم ہے تاہم اس میں اور عام بیع میں حسب ذیل فرق ہے۔

1. اجارہ میں صرف اثاثے اور جائیداد کا حق استعمال فروخت کیا جاتا ہے، ملکیتی حقوق بدستور

---

[1] الروض المربع، باب الاجارۃ.

مالک کے پاس ہی رہتے ہیں، جیسا کہ ہم گزشتہ سطور میں بیان کر آئے ہیں جبکہ بیع میں ملکیت بھی خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

2. انعقاد بیع کے بعد اس کے نتائج مؤخر نہیں کیے جا سکتے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ بیع تو آج کر لیں مگر اس کے اثرات جیسے انتقال ملکیت، مشتری کے ذمے قیمت کا وجوب وغیرہ مستقبل میں ظاہر ہوں، جبکہ اجارہ میں اس کی گنجائش ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اجارہ کا معاملہ اس طرح کرے کہ یہ اجارہ تین دن یا ایک مہینہ یا ایک سال بعد شروع ہوگا تو یہ جائز ہے اور جب وہ تاریخ آئے گی تو طے شدہ شرائط کے مطابق اجارہ شروع ہو جائے گا۔[1]

3. بیع دائمی ہوتی ہے اور اجارہ محدود مدت کے لیے۔ یہی وجہ ہے اجارہ کی تعریف میں متعین مدت کی قید لازمی لگائی جاتی ہے، جیسا کہ اجارہ کی تعریف سے مترشح ہے۔

اجارہ اور قرض میں فرق

بعض حضرات قرض کو اجارہ پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح اجارہ کی آمدنی جائز ہے اسی طرح قرض سے حاصل شدہ فوائد بھی جائز ہونے چاہئیں، کیونکہ اجارہ اور قرض ایک حد تک باہم ملتے جلتے ہیں کہ دونوں میں بغیر کسی محنت اور مشقت کے مستقل آمدنی وصول کی جاتی ہے، مگر یہ قیاس درست نہیں، کیونکہ قرض اور اجارہ کے درمیان متعدد نمایاں فرق ہیں جو درج ذیل ہیں۔

- اسلامی نقطۂ نگاہ سے قرض کا مقصد قرض گیر کے ساتھ نیکی اور احسان کرنا ہے نہ کہ فائدہ حاصل کرنا، لہٰذا اس کا معاوضہ نہیں لیا جا سکتا، جبکہ اجارہ ان معاملات میں شامل ہے جن میں ایک فریق دوسرے سے معاوضہ لینے کا حق رکھتا ہے۔
- اجارہ صرف انہی اشیاء میں ہوتا ہے جو استعمال کے بعد باقی رہیں جبکہ قرض کے قابل صرف

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الایجارات، باب اذا استأجر اجیرا لیعمل له بعد ثلاثة أيام أو بعد شهر أو بعد سنة جاز.

وہی اشیاء ہیں جنہیں استعمال کرنے کیلئے انہیں بذات خود خرچ کرنا پڑے، اس کے بغیر ان کا استعمال ممکن نہ ہو، جیسے مختلف ممالک کی کرنسیاں ہیں کہ جب تک ان کو خرچ نہ کیا جائے ان سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ اگر قرض کی شکل میں کوئی ایسی شئی دی جائے جو استعمال کے بعد بھی باقی رہے تو اس کو اعارہ یا عاریہ کہا جاتا ہے۔ عاریہ میں بعینہ وہی شئی واپس کرنا ضروری ہے۔

- کرایہ پر دی گئی چیز کی افادیت کو برقرار رکھنا مالک کے فرائض میں شامل ہے جس کیلئے بعض اوقات اسے مزید اخراجات بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس قرض کے مال کو برقرار رکھنے کیلئے مزید اخراجات کی ضرورت نہیں ہوتی۔
- اجارہ میں چیز بدستور مالک کی ملکیت میں رہتی ہے اور طے شدہ مدت گذرنے کے بعد بعینہ وہی چیز واپس کرنا ضروری ہے، اور اگر دوران مدت اجارہ پر دی گئی چیز کا کوئی نقصان ہو جائے بشرطیکہ کرایہ دار کی غفلت یا غلط استعمال کی وجہ سے نہ ہوا ہو تو اس کا ذمہ دار مالک خود ہی ہوتا ہے، جبکہ قرض میں اتنی مدت کیلئے ملکیت بھی قرض گیر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اس لئے وہ ہر حال میں اس کی واپسی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور بعینہ قرض دی گئی چیز لوٹانا لازمی نہیں ہوتا بلکہ اس کی مثل بھی واپس کی جاسکتی ہے۔

اجارہ قرآن وحدیث کے آئینے میں

اجارے کا جواز قرآن مجید، حدیث رسول ﷺ اور اجماع امت تینوں سے ثابت ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ جب حضرت خضر علیہ السلام نے ایک جھکی ہوئی دیوار کو اجرت لیے بغیر سیدھا کر دیا تو سیدنا موسی علیہ السلام نے فرمایا:

﴿لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا﴾

"اگر آپ چاہتے تو اس پر اجرت لے لیتے۔"[1]

[1] الکهف :77.

حضرت شعیب کی صاحبزادی نے اپنے والد سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے متعلق عرض کیا:

﴿يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ﴾

''اے ابا جان اس کو ملازم رکھ لیجیے، بے شک بہتر شخص جسے آپ ملازم رکھیں وہ ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔''①

مطلقہ کے بارے میں فرمایا:

﴿فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ﴾

''پھر اگر وہ (وضع حمل کے بعد) تمھارے (بچے کو) دودھ پلائیں تو تم انہیں ان کی اجرت دو۔''②

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

' أعط الأجير أجره قبل أن يجف عرقه '

''مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے قبل اس کی اجرت ادا کر دو۔''③

صحیح بخاری میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے واقعہ ہجرت کے ضمن میں مروی ہے:

'اسْتَأْجَرَ النَّبِيُّ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ رَجُلًا مِنْ بَنِي الدِّيلِ ثُمَّ مِنْ بَنِي عَبْدِ بْنِ عَدِيٍّ هَادِيًا خِرِّيتًا'

''نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنو دیل کے ایک شخص (عبداللہ بن اریقط) کو جو راستوں کا ماہر تھا اجرت پر ساتھ لیا۔''④

امام بخاری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

---

① القصص :26.

② الطلاق : ٦

③ سنن ابن ماجه : باب اجر الاجراء.

④ صحيح البخاري ، كتاب الاجارة ،باب اذااستأجر أ جيرا ليعمل له بعد ثلاثة ايام .

((وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ أَعْطَى النَّبِيُّ ﷺ خَيْبَرَ بِالشَّطْرِ، فَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ وَأَبِي بَكْرٍ وَصَدْرًا مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ))

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی ﷺ نے یہودیوں کو خیبر کی اراضی نصف پیداوار کے عوض اجارہ پر دی۔ یہ اجارہ عہد نبوی ﷺ کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ اور حضرت عمر کی خلافت کے ابتدائی دور میں بھی جاری رہا۔''[1]

امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'الْإِجَارَةُ بِكِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَى وَبِالْأَخْبَارِ الثَّابِتَةِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَاتَّفَقَ عَلَى إِجَازَتِهَا كُلُّ مَنْ نَحْفَظُ قَوْلَهُ مِنْ عُلَمَاءِ الْأُمَّةِ وَالْحَاجَةُ دَاعِيَةٌ إِلَيْهَا لِأَنَّ أَكْثَرَ الْمَنَافِعِ بِالصَّنَائِعِ'

''اجارہ کتاب اللہ اور نبی ﷺ کی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اور اس کے جواز پر وہ تمام علمائے امت متفق ہیں جن کے اقوال ہمیں یاد ہیں۔ علاوہ ازیں لوگوں کی حاجت وضرورت بھی اس کے جواز کی متقاضی ہے کیونکہ اکثر فوائد مختلف پیشوں سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔''[2]

اجارہ میں پنہاں حکمتیں

اجارہ انسانوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی آسان بنانے کا اہم ذریعہ ہے کیونکہ بسا اوقات انسان کو کسی چیز کی اشد ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ چیز اس کی قوت خرید سے باہر ہوتی ہے یا وہ خریدنے پر قادر تو ہوتا ہے مگر اس کی مالیت کے مقابلے میں فائدہ بہت کم ہوتا ہے اس وجہ سے انسان خریداری کی جگہ کرایہ داری کے معاملے کو ترجیح دیتا ہے۔ یا بعض اوقات اس کے پاس کوئی

---

① صحیح بخاری : کتاب الاجارات، باب اذا استأجر ارضافمات احدهما

② شرح منتهى الارادات باب الاجارة.

ایسا اثاثہ یا جائیداد ہوتی ہے جس کی اسے فوری حاجت تو نہیں ہوتی لیکن مستقبل میں ضرورت پیش آنے کا امکان ہوتا ہے اس صورت میں بھی فروخت کی بجائے اجارہ کا معاملہ طے کرنا بہتر ہوتا ہے تا کہ اثاثہ اور جائیداد بھی ہاتھ سے نہ نکلے اور فائدہ بھی حاصل ہوتا رہے۔

اسی طرح دوسروں کی خدمات حاصل کرنا بھی انسانی معاشرہ کی بنیادی ضرورت ہے کیونکہ پروردگار عالم نے اس دنیا کا نظام اس طرح قائم کیا ہے کہ یہاں ہر شخص اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے سلسلے میں دوسروں کی طرف رجوع کا محتاج ہے۔اس کرہ ارضی پر شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو جسے اپنی زندگی میں کسی نہ کسی پہلو سے دوسروں کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو۔قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾

''ہم ہی نے دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کر دی ہے اور بعض کو بعض پر درجات میں بلند رکھا ہے تا کہ یہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔اور تیرے رب کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ سمیٹ رہے ہیں۔''[1]

علاوہ ازیں اس میں یہ حکمت بھی پنہاں ہے کہ دنیا میں بیشتر افراد کا روزگار اجارہ ہی سے وابستہ ہے، اس پر پابندی کی وجہ سے بے روزگاری میں انتہائی تشویش ناک حد تک اضافہ ہو جاتا۔یعنی ہماری معاشی سرگرمیوں میں اجارہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر دنیا کا نظام نہیں چل سکتا،لہذا اس کی اجازت اللہ تعالی کی خاص کرم نوازی ہے۔اگر اللہ تعالی اس کو جائز قرار نہ دیتے تو ہمیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

---

[1] الزخرف 32.

اجارہ/لیز کی شرائط

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے اجارہ کی دونوں قسمیں جائز ہیں اور شریعت اسلامی دونوں کے قواعد وضوابط پر روشنی ڈالتی ہے لیکن ہم یہاں صرف پٹہ داری کے احکام وشرائط ہی ذکر کریں گے، کیونکہ مروجہ اسلامی بینکوں کی اجارہ مصنوعات کی بنیاد یہی قسم ہے۔ اجارہ/لیز کے احکام تو بہت مفصل ہیں جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں، تاہم ذیل میں ضروری احکام کا جامع خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

- صرف وہی چیز اجارہ پر دی جا سکتی ہے جو پٹہ دہندہ (Lessor) کی ملکیت ہو اور اس کے قبضہ میں آ چکی ہو۔ ملکیت اور قبضہ سے قبل کسی کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ جو چیز انسان کے پاس موجود نہ ہو اس کی بیع منع ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

'وَلَا بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ'

"جو چیز تیرے پاس موجود نہیں اس کی بیع درست نہیں۔"[1]

اجارہ کسی چیز کے حق استعمال کی بیع ہے، لہٰذا جس طرح غیر ملکیتی چیز کی فروخت صحیح نہیں اسی طرح اس کو اجارہ پر دینے کا معاملہ بھی صحیح نہیں۔

البتہ کسی کلائنٹ کو اس کی ضرورت کا اثاثہ خرید کر اجارہ پر دینے کا وعدہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس وعدہ کی پابندی دونوں یا کسی ایک فریق کے لیے لازم نہ ہو، کیونکہ لازمی وعدہ کا مطلب ہے کہ پٹہ دہندہ نے اثاثہ خریدنے سے پہلے ہی اجارہ کا معاملہ کر لیا ہے جو درست نہیں۔ اس لیے کہ خرید وفروخت کے معاملات میں ایسا وعدہ جس کی پابندی ضروری ہو حقیقت میں عقد ہی ہوتا ہے جو مستقبل کی تاریخ کو مؤثر ہو رہا ہوتا ہے۔

- اگر پٹہ دہندہ/بینک یا مالیاتی ادارہ کسی اثاثے کو خریدنے سے قبل ہی اجارہ پر دینے کا وعدہ کر

---

[1] سنن الترمذی، باب ما جاء فی کراهية بيع ما ليس عنده .

چکا ہوتو وہ اس کی خریداری کے لیے اس شخص کو اپنا ایجنٹ (وکیل) مقرر نہ کرے جو اثاثہ خود کرایہ پر لینا چاہتا ہو کیونکہ اس صورت میں پٹہ دہندہ بینک یا مالیاتی ادارے کا کردار مالی وسائل فراہم کر کے فائدہ حاصل کرنے تک رہ جاتا ہے، جس سے یہ معاملہ سودی قرض کے مشابہ بن جاتا ہے، اس لیے کہ دونوں صورتوں عملاً میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سود کی شدید حرمت کے پیش نظر اس تکنیک سے پرہیز اور احتراز واجب ہے۔

- اجارہ کے معاملہ میں ''معقود علیہ'' (Subject Matter) اجارہ شدہ اثاثے اور جائیداد کا فائدہ یا حق استعمال ہوتا ہے، اس لیے عقدِ اجارہ صحیح ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ جس فائدے یا حق استعمال کو اجارہ پر دینا مقصود ہو وہ غیر مبہم، متعین اور معلوم ہو، تاکہ بعد میں فریقین کے درمیان کسی قسم کا نزاع پیدا نہ ہو۔ مجہول منفعت کا اجارہ قطعی ناجائز ہے کیونکہ یہ غرر (Uncertainty) میں داخل ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔
- قرض دینے کی شرط پر اجارہ کا معاملہ کرنا یا اجارہ کی شرط پر قرض دینا جائز نہیں یعنی یہ کہنا کہ میں آپ کو قرض دوں گا بشرطیکہ آپ میرے ساتھ اجارہ کا معاملہ کریں یا میں آپ کے ساتھ اس شرط پر اجارہ کا معاملہ کروں گا کہ آپ اس کے بدلے مجھے اتنا قرض دیں ناجائز ہے، جیسا کہ آنحضور ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

'لَا یَحِلُّ بَیْعٌ وَّ سَلَفٌ'

''بیع اور قرض جمع نہیں ہو سکتے۔''[1]

بیع میں اجارہ بھی شامل ہے لہٰذا قرض اور اجارہ کا معاملہ بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

'وإن شرط فی القرض أن یؤجرہ دارہ أو یبیعہ شیئا أو أن یقرضہ المقترض مرۃ أخری لم یجز لأن النبی ﷺ نھی عن بیع و سلف

[1] سنن الترمذی، باب ما جاء فی کراھیة بیع مالیس عندہ .

ولأنه شرط عقدا في عقد فلم يجز '

''اور اگر قرض میں یہ شرط لگائے کہ وہ اسے اپنا گھر کرایہ پر دے گا یا اسے کوئی چیز بیچے گا یا کسی موقع پر قرض لینے والا اسے قرض دے گا تو یہ جائز نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے بیع اور قرض سے منع فرمایا ہے۔ اور یہ اس لئے بھی منع ہے کہ اس نے ایک عقد میں دوسرے عقد کی شرط لگائی ہے جو ناجائز ہے۔''[1]

- اجارہ کا معاملہ طے کرتے وقت اس امر کا تعین بھی ضروری ہے کہ یومیہ، ماہانہ یا سالانہ کرایہ کیا ہوگا، تاکہ اس میں غرر کا عنصر شامل نہ ہو، اور اگر اجارہ طویل مدت کے لیے ہو تو پھر یہ بھی طے ہو جانا چاہیے کہ آئندہ اس میں اضافہ کتنی مدت بعد ہوگا، اور کس تناسب سے گا۔ مثلاً پانچ فیصد سالانہ۔
- جب تک پٹہ دہندہ اجارہ شدہ اثاثہ پٹہ دار کے قبضہ میں نہیں دے دیتا یا معاہدہ اجارہ کے اندر کرائے کا کچھ حصہ پیشگی ادا کرنے کی شرط نہیں لگالیتا وہ کرائے کی وصولی کا استحقاق نہیں رکھتا۔ تاہم معاہدہ اجارہ سے قبل کرائے کی ادائیگی کا مطالبہ درست نہیں۔
- کرائے کی ادائیگی میں تأخیر کی بنا پر پٹہ دار سے اضافی رقم وصول کرنی جائز نہیں، کیونکہ کرایہ واجب الادا ہونے کے بعد کرایہ دار کے ذمہ دَین (Debt) بن جاتا ہے جس پر ملنے والا کوئی بھی اضافہ سود کی تعریف میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوتا ہے۔ اگرچہ پٹہ دہندہ بینک یا مالیاتی ادارہ یہ اضافی رقم نیکی اور بھلائی کے کاموں پر خرچ کرنے کے ارادے سے حاصل کرنا چاہتا ہو مگر پھر بھی جائز نہیں۔ (دوسرا البرکہ سیمینار فتوی نمبر ۱۲ ملاحظہ ہو جدید اقتصادی مسائل شریعت کی نظر میں: ص ۴۳)
- اجارہ پر لینے والا شخص (Lessee) صرف چیز کا حق استعمال خریدتا ہے۔ اجارہ کے پورے عرصہ کے دوران اصل چیز پٹہ دہندہ (Lessor) کی ملکیت میں رہتی ہے اس لیے

---

[1] المغني ج 6 ص 437.

اگر اجارہ کی مدت کے دوران لیز شدہ چیز کا کوئی نقصان ہو جائے تو وہ پٹہ دہندہ برداشت کرے گا۔ تاہم پٹہ دار کی بے اعتنائی یا بدعہدی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کے اثرات اسے خود ہی برداشت کرنا ہوں گے۔ کیونکہ اجارہ شدہ اثاثہ پٹہ دار کے پاس امانت ہوتا ہے لہٰذا وہ صرف اسی صورت کا ذمہ دار ہوگا جب نقصان اس کی عدم توجہ یا غلط استعمال کے باعث ہوا ہو۔

- لیز کی پوری مدت کے دوران لیز شدہ اثاثے کو قابل استعمال حالت میں رکھنا پٹہ دہندہ کی ذمہ داری ہے کیونکہ پٹہ دار سے لیا جانے والا کرایہ دراصل اثاثے سے فائدہ اٹھانے کا معاوضہ ہے، لہٰذا پٹہ دہندہ کا فرض ہے کہ وہ اس کو درست حالت میں رکھے، تاکہ پٹہ دار اس سے مکمل فائدہ حاصل کر سکے۔ البتہ جن اخراجات کا تعلق استعمال سے ہو جیسے بجلی اور گیس وغیرہ کا بل وہ پٹہ دار خود برداشت کرے گا۔
- اجارہ میں یہ شرط لگانا جائز نہیں کہ اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد لیز شدہ چیز پٹہ دار کو فروخت یا ہبہ کر دی جائے گی کیونکہ اس طرح ایک عقد میں دو عقد جمع ہو جاتے ہیں جو شرعاً ممنوع ہے۔ چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

'نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ '

''رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع سے منع فرمایا ہے۔''[1]

- جب اصلی مالک اجازت دے یا عرف عام میں ایسا کرنا جائز سمجھا جاتا ہو تو پٹہ دار وہی اثاثہ اور جائیداد کسی دوسرے شخص کو بھی کرایہ پر دے سکتا ہے، خواہ دوسرے شخص سے لیا جانے والا کرایہ اصلی مالک کو ادا کیے جانے والے کرائے کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو یا زائد۔ اس کو ضمنی اجارہ (Sub Lease) کہا جاتا ہے۔ عربی میں اس کے لیے 'التأجير من الباطن' کی اصطلاح وضع ہے۔

---

[1] سنن ترمذی: باب ماجاء فی النھی عن بیعتین فی بیعة ۔ سنن نسائی بیعتین فی بیعة

اس کی دلیل یہ ہے کہ انعقاد اجارہ کے بعد اس چیز کی منفعت مکمل طور پر پٹہ دار کی ملکیت بن جاتی ہے، لہٰذا وہ یہ منفعت جسے چاہے فروخت کرے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ دوسرا کرایہ دار اس سے اتنا ہی فائدہ حاصل کرے جتنا پہلے کرایہ دار نے طے کیا تھا یا اس سے کم، مثلاً ایک شخص نے رہائش کے لیے کسی سے مکان کرایہ پر لیا تو وہ کسی دوسرے کو رہائش کے لیے دے سکتا ہے، مگر فیکٹری لگانے کے لیے دینا جائز نہیں کیونکہ اس سے مکان کو زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔کویت کے فقہی انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔

'جمهور الفقهاء (الحنفيّة والمالكيّة والشّافعيّة والأصحّ عند الحنابلة) على جواز إيجار المستأجر إلى غير المؤجر الشّيء الّذى استأجره وقبضه فى مدّة العقد، ما دامت العين لا تتأثّر باختلاف المستعمل، وقد أجازه كثير من فقهاء السّلف، سواء أكان بمثل الأجرة أم بزيادة'

''جمہور فقہاء یعنی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مسلک کے صحیح قول کے مطابق پٹہ دار مدت اجارہ کے دوران پٹہ پر لی گئی چیز پٹہ دہندہ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو کرایہ پر دے سکتا ہے بشرطیکہ استعمال کنندہ کے بدلنے سے اجارہ شدہ چیز متاثر نہ ہو۔سلف میں سے اکثر فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے خواہ پہلے کرائے پر ہی دی جائے یا زائد پر۔''[1]

لیکن اگر عرف عام میں مالک کی اجازت کے بغیر دوسرے کو کرایہ پر دینا جائز نہ سمجھا جاتا ہو یا مالک نے اس سے منع کر دیا ہو تو پھر اس کی واضح اجازت کے بغیر کسی اور کو کرایہ پر دینا جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں منفعت کی ملکیت پٹہ دار کی طرف اس قید کے ساتھ منتقل ہوئی ہے کہ وہ آگے کسی دوسرے شخص کو کرایہ پر نہیں دے گا، لہٰذا اس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔

✿ فریقین کی باہمی رضامندی کے بغیر طے شدہ مدت سے قبل اجارہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔اس کی

① الموسوعة الفقهية: ج1، ص267.

وجہ یہ ہے کہ بیع کی طرح اجارہ بھی عقد لازم ہے، لہٰذا کسی فریق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے یکطرفہ ختم کردے۔ چنانچہ ''نیل المآرب'' میں ہے۔

'والاجارة عقد لازم من الطرفين ليس لواحد منهما فسخها بلا موجب ،لانها عقد معاوضة فكان لازما كالبيع'

''اجارہ عقد لازم ہے۔ فریقین میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے بلا وجہ فسخ کر دے، کیونکہ یہ عقد معاوضہ ہے لہذا یہ بیع کی طرح لازم ہے۔''[1]

ہاں اگر اجارہ شدہ اثاثہ قابل استعمال نہ رہے یا پٹہ دار طے شدہ شرائط کی پابندی نہ کر رہا ہو تو ایسی صورت میں دوسرے فریق کو یکطرفہ فسخ کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

فائنانشل لیز

اسلامی نظام معیشت سے شغف رکھنے والا ہر طالب علم اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ اجارے یعنی لیز کا مقصد تمویل (فائنانسنگ) قطعاً نہیں ہے، بلکہ یہ محض کسی چیز کے حق استعمال کے لین دین کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے اسلامی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کو مالیاتی سہولت کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا گیا، حالانکہ ہر دور میں سرمایہ حاصل کرنے والے بھی موجود رہے ہیں اور سرمایہ لگانے والے بھی۔

لیزنگ/ اجارہ کو بطور تمویل کے لیے استعمال کرنے کا تصور ماضی قریب کی پیداوار ہے جسے ۱۹۵۰ کی دہائی میں ایک امریکی مالیاتی ادارے نے متعارف کرایا۔ اس سے پہلے لیزنگ کا بحیثیت مالیاتی سہولت کے کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ اسے زیادہ مقبولیت ۱۹۶۰ کے عشرہ میں حاصل ہوئی جب فرانس کے مالیاتی اداروں نے امریکی نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے ہاں اس کا آغاز کیا۔[2]

---

[1] نيل المآرب بشرح دليل الطالب : ص202.

[2] البيوع الائتمانية بين الحل و الحرمة ص 53،لدكتور محمد بن عبدالله الشباني .

لیزنگ/اجارہ چونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے تمویل کا ذریعہ نہیں ہے، اس لیے ان مالیاتی اداروں نے لیز کی دو قسمیں بنادی ہیں۔

1. آپریٹنگ لیز: یعنی استعمالی اجارہ (اجارہ تشغیلیہ) یہ وہ اجارہ ہے جس کا تصور شریعت نے دیا ہے، اس میں فریقین کے مابین واقعتاً پٹہ دہندہ اور پٹہ دار کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہ قسم سرمایہ کی ضرورت پوری کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔
2. فائنانشل لیز: اس میں فریقین کے پیش نظر اجارے کا تعلق قائم کرنا نہیں بلکہ پٹہ دہندہ کا مقصد سرمایہ لگانا اور پٹہ دار کی نیت سرمائے کی سہولت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس کو اردو میں ''کامل ادائیگی پٹہ داری'' اور عربی میں 'الاجارۃ التمویلیۃ' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

سودی بینکوں کا طریقہ اور اس کی قباحتیں

روائتی بینکوں میں فائنانشل لیز کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کو گاڑی/مشینری کی ضرورت ہے تو وہ بینک سے قرض لے کر خود خریدنے کی بجائے بینک سے کہتا ہے کہ آپ اس قسم کی گاڑی یا مشینری خرید کر مجھے کرایہ پر دے دیں۔ اس دوران گاڑی اور مشینری کا مالک بینک ہی رہتا ہے وہ شخص صرف پٹہ دار ہونے کی حیثیت سے اسے استعمال کرتا ہے۔ ایک مخصوص مدت کے لیے کرایہ اس طرح طے کیا جاتا ہے کہ بینک کو گاڑی یا مشینری کی قیمت مع اس سود کے جو اتنی مدت میں اس رقم پر بینک کو ملنا تھا وصول ہو جائے۔ جب یہ مدت گذر جاتی ہے اور بینک کو کرایہ کی شکل میں گاڑی اور مشینری کی قیمت مع متعین شرح سود وصول ہو جاتی ہے تو گاڑی اور مشینری خود بخود پٹہ دار کی ملکیت بن جاتی ہے۔ یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ بینک اس شخص کو گاڑی یا مشینری دینے کی بجائے رقم دیتا ہے جو طے شدہ اضافے کے ساتھ واپس لی جاتی ہے، عملاً چیز کا لین دین نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا طریقہ میں چونکہ بینک اور کلائنٹ دونوں کا فائدہ ہے اس لیے فریقین قرض کی بجائے اسے اختیار کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

بینک کا فائدہ یہ ہے کہ رقم کی وصولیابی کے لیے قرض کی نسبت یہ طریقہ زیادہ باعث اعتماد ہے، کیونکہ اس میں گاڑی اور مشینری بینک کی ملکیت ہی رہتی ہے، رقم واپس نہ ملنے کی صورت میں بینک اسے فروخت کرسکتا ہے۔

کلائنٹ کا فائدہ یہ ہے کہ وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے کیونکہ جب تک لیز کی تمام اقساط ادا نہیں کردی جاتیں لیز شدہ اثاثہ اس کی ملکیت میں نہیں آتا جس کے نتیجے میں اسے اتنا عرصہ ٹیکس سے چھوٹ مل جاتی ہے۔ یہاں یہ مسئلہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کسی شئی کے مفید ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شرعاً بھی جائز ہو۔

روائتی بینکوں میں لیزنگ کی جو عملی صورت رائج ہے وہ متعدد ایسی خرابیوں پر مشتمل ہے جن کی شریعت میں قطعاً گنجائش نہیں۔ وہ خرابیاں درج ذیل ہیں۔

1. یہ حقیقت میں سودی معاملہ ہے جسے فریقین نے مذکورہ بالا فوائد کے پیش نظر لیز کا نام دے دیا ہے۔اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ بینک کلائنٹ کو گاڑی یا مشینری خرید کر نہیں دیتا بلکہ رقم دیتا ہے اور اس پر طے شدہ نفع لیتا ہے جو سود کے زمرہ میں آتا ہے۔

اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ بینک رقم مہیا کرنے کے دن سے ہی کرایہ لینا شروع کر دیتا ہے، خواہ کلائنٹ کو گاڑی یا مشینری چند ماہ بعد ملے۔ اگر یہ لیزنگ کا معاملہ ہوتا تو کرایہ حوالگی کے دن سے شروع ہوتا نہ کہ رقم کی فراہمی کی تاریخ سے۔ نیز اس میں قسط کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ لیا جاتا ہے، یہ بھی سود میں داخل ہے۔

2. ایک ہی عقد میں لیز اور بیع کے دو معاملے جمع ہو جاتے ہیں شرعاً ایسا کرنا ممنوع ہے۔

3. لیز شدہ اثاثے کا نقصان کلائنٹ خود برداشت کرتا ہے، حالانکہ اس کا ازالہ بینک کی ذمہ داری ہے کیونکہ مالک وہ ہے۔

اسلامی بینکوں کا طریق کار

جبکہ اسلامی بینکوں کی اجارہ مصنوعات کے نمایاں خدّ وخال یہ ہیں۔

- ایک شخص جسے گاڑی یا مشینری کی خریداری کے لیے سرمایہ درکار ہے بینک سے درخواست کرتا ہے کہ اسے اس قسم کی گاڑی یا مشینری خرید کر اجارہ پر دے دی جائے۔ اگر اس کی مالی حالت اطمینان بخش ہو تو بینک اس کو مطلوبہ سہولت فراہم کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔
- سب سے پہلے فریقین کے درمیان ماسٹر فائنانسگ ایگریمنٹ یعنی ''اصولی معاہدہ برائے فراہمی تمویل'' کے عنوان سے باہمی مفاہمت کے ایک معاہدے پر دستخط ہوتے ہیں جس میں وہ تمام شرائط وضوابط درج ہوتی ہیں جن کے مطابق اجارہ کا معاملہ وجود میں آنا ہوتا ہے۔ اس موقع پر بینک درخواست دہندہ سے یکطرفہ طور پر یہ وعدہ بھی لے لیتا ہے کہ جب بینک مارکیٹ سے اس کی مطلوبہ گاڑی خرید لے گا تو وہ ضرور اجارہ پر لے گا، اور اگر اس نے بینک کی خریداری کے بعد وہ چیز اجارہ پر نہ لی اور بینک کو اپنی لاگت سے کم قیمت پر دوسری جگہ بیچنی پڑی تو بینک کے اس نقصان کی تلافی وہ کرے گا۔ نیز اسی موقع پر بینک درخواست دہندہ سے مطلوبہ چیز کی قیمت کا کچھ حصہ بالعموم بیس فیصد نقد رقم کی صورت میں جسے اسلامی بینک سیکورٹی ڈپازٹ کا نام دیتے ہیں پیشگی وصول پا لیتا ہے تا کہ اگر وہ بینک کی خریداری کے بعد اپنا وعدہ ایفاء نہ کرے، یا ادائیگی میں ناکام رہے، یا دیوالیہ ہو جائے، یا اگر گاڑی واپس کرے اور اس کی لاپروائی یا بدعہدی کے باعث کوئی نقصان ہوا ہو تو اس رقم سے وصول کرنے میں سہولت رہے۔

البتہ معاہدۂ اجارہ پر دستخط مطلوبہ چیز کے حصول کے بعد ہوتے ہیں۔ چونکہ اجارہ کی تمام شرائط وضوابط ماسٹر فائنانسگ ایگریمنٹ کی صورت میں پہلے ہی طے پا چکی ہوتیں ہیں اور اس معاہدے میں بھی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ اجارہ انہی شرائط وضوابط کے مطابق منعقد ہو رہا ہے جو ماسٹر فائنانسگ ایگریمنٹ میں مذکور ہیں خصوصا کارپوریٹ اجارہ میں تو یہ معاہدہ اس اصولی معاہدے کا ضمیمہ ہی قرار پاتا ہے، لہذا معاہدہ اجارہ پر دستخط کو محض رسمی کارروائی سمجھنا چاہیے۔

- اجارہ کے معاہدے پر دستخط کراتے وقت بینک کلائنٹ سے یہ وعدہ بھی لے لیتا ہے کہ اگر

دوران اجارہ فلاں فلاں شق کی خلاف ورزی کی وجہ سے بینک نے اجارہ ختم کر دیا تو وہ اجارہ شدہ اثاثہ خریدنے کا پابند ہوگا اور مختلف مہینوں کے حساب سے قیمت بھی متعین کر دی جاتی ہے کہ پہلے مہینے یہ، دوسرے اور تیسرے مہینے یہ قیمت ہوگی۔ نیز اس موقع پر بینک بھی یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر کلائنٹ تمام اقساط باقاعدگی سے ادا کرتا رہا تو وہ اختتام اجارہ پر گاڑی اس کو فروخت کرنے کے بارے میں سوچے گا۔ بینک کی طرف سے کئے گئے وعدہ پر قبول کنندہ کی حیثیت سے کلائنٹ کے بھی دستخط ہوتے ہیں۔

- بعض اوقات بینک بالخصوص جب اجارہ شدہ اثاثہ پہلے سے استعمال شدہ یا درآمدی مشینری ہو کلائنٹ سے ہی کہہ دیتا ہے کہ وہ اس کے ایجنٹ کی حیثیت سے اپنی مطلوبہ چیز خود ہی خرید لے۔ اور اگر مطلوبہ چیز دوسرے ملک سے درآمد کی جارہی ہو تو کلائنٹ کو اس پر قبضے کا وکیل بھی بنا دیتا ہے۔

- کرایہ کی اقساط اس تناسب سے مقرر کی جاتی ہیں کہ اختتامِ اجارہ تک بینک کو گاڑی کی قیمت بھی وصول ہو جائے اور اتنی مدت کے لیے اگر یہ رقم قرض پر دی جاتی تو جتنا سود ملنا تھا وہ بھی وصول ہو جائے، یعنی روائتی بینکوں کی شرح سود ہی اسلامی بینکوں کے نفع کی شرح کا معیار ہوتی ہے۔ مروجہ اسلامی بینکوں میں منافع اور کرائے کے تعین کے لیے کائبور یعنی کراچی انٹر بینک آفرڈ ریٹ کو معیار بنانا ہر کس و ناکس کے علم میں ہے۔

- بینک جو رقم سیکورٹی ڈپازٹ کی مد میں لیتا ہے وہ منہا کر کے بقیہ رقم کے حساب سے قسطیں مقرر کرتا ہے کیونکہ بینک نے اپنے سرمائے پر ہی منافع لینا ہے۔ یہی وجہ ہے اگر کوئی کلائنٹ بینک کی فرمائش سے زائد رقم سیکورٹی ڈپازٹ کے طور پر جمع کرا دے تو اس کے کرائے کی قسط کم رکھی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص اسلامی بینک سے دس لاکھ مالیت کی گاڑی تین سال کے لیے اجارہ پر لیتا ہے اور سیکورٹی ڈپازٹ میں دو لاکھ جمع کراتا ہے تو بینک قسطیں اس تناسب سے مقرر کرے گا کہ ان تین سالوں میں آٹھ لاکھ بھی واپس مل جائے اور

اس دوران اس رقم پر جو سود ملنا تھا وہ بھی موصول ہو جائے۔لیکن اگر سیکورٹی ڈپازٹ کی مد میں تین لاکھ جمع کرادے تو بینک سات لاکھ کے سود کی نسبت سے قسطیں مقرر کرے گا جو پہلی صورت سے بہر حال کم ہونگی۔

- بینک قسطیں مقرر کرتے وقت گاڑی کی بکنگ کی تاریخ سے قبضہ(Delivery) تک کی درمیانی مدت(Grace Period) کے دوران بکنگ کی رقم پر حاصل ہونے والے متوقع سود کو بھی اپنی لاگت کا حصہ بنالیتا ہے اور اسی کے مطابق قسطیں مقرر کی جاتی ہیں۔
- اگر پٹہ دار مقررہ تاریخ یا توسیع کی مدت تک ادائیگی میں ناکام رہے تو اس سے جرمانہ لیا جاتا ہے جو بینک کی زیرنگرانی قائم چیرٹی فنڈ میں جمع ہوتا ہے اور بینک اس فنڈ کو اپنی مکمل صوابدید کے مطابق چیرٹی مقاصد کیلئے استعمال کرتا ہے۔یہ جرمانہ شرح سود کے مطابق اور یومیہ بنیاد پر لیا جاتا ہے۔
- جب اجارہ کی مدت مکمل ہو جاتی ہے اور کرائے کی شکل میں گاڑی کی قیمت شرح سود کے مطابق نفع سمیت ادا ہو جاتی ہے تو بینک گاڑی کلائنٹ کے نام منتقل کر دیتا ہے اور سیکورٹی ڈپازٹ کے طور پر جمع کرائی گئی رقم اس کا معاوضہ قرار پاتی ہے۔

واضح رہے فریقین کو شروع ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس طرح اختتام پذیر ہو گا۔کیونکہ معاہدہ اجارہ ،کلائنٹ کی طرف سے خریداری اور بنک کی جانب سے فروخت پر غور کا وعدہ سب مطبوعہ شکل میں وعدہ اجارہ کے ساتھ ہی منسلک ہوتے ہیں اور جب کوئی اجارہ کا خواشمند آتا ہے تو یہ سب اس کو اکھٹے ہی فراہم کئے جاتے ہیں۔

قابل غور پہلو

کیا مذکورہ بالا طریق کار میں اسلامی اصولوں کی مکمل پاسداری کی گئی ہے اور مروجہ اسلامی بینکوں کی طرف سے پیش کی گئیں اجارہ مصنوعات شرعی اجارہ کی شرائط وضوابط کے عین مطابق ہیں؟ یہ جاننے کے لئے ماسٹر فائنانسنگ ایگریمنٹ کے موقع پر کلائنٹ سے لئے گئے لازمی

وعدہ، سیکورٹی ڈپازٹ اور مطلوبہ چیز کی کلائنٹ کے ذریعے خریداری کا تحقیقی جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔

قانونی اعتبار سے لازم وعدہ کی شرعی حیثیت

مروجہ اسلامی بینکاری کے حامیوں کے نزدیک کلائنٹ سے وعدہ لینے کا مقصد صرف بینک کو یہ یقین دلانا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ضرور اجارہ کا معاملہ کرے گا تا کہ بینک پورے اطمینان کے ساتھ مطلوبہ چیز کی خریداری کر سکے۔ اس سے اجارہ منعقد نہیں ہوتا بلکہ اجارہ کا باضابطہ معاہدہ مطلوبہ چیز حاصل کرنے کے بعد طے پاتا ہے۔

لیکن اگر معمولی غور وفکر کیا جائے تو یہ موقف خاصا کمزور نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ باضابطہ معاہدے کی حیثیت علامتی کارروائی کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ قانونی لحاظ سے کلائنٹ اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ وہ بینک کی خریدی ہوئی چیز بہر حال ماسٹر فائنانسنگ ایگریمنٹ میں طے شدہ شرائط کے مطابق اجارہ پر لے۔ اور اگر پس وپیش کرے تو بینک قانونی چارہ جوئی کے لئے عدالت سے بھی رجوع کر سکتا ہے اور عدالت اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ بینک کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرے۔ علاوہ ازیں وعدہ اجارہ کے موقع پر بینک سیکورٹی ڈپازٹ کے نام پر ایک معقول رقم بھی وصول پا چکا ہوتا ہے تا کہ اگر بینک کی خریداری کے بعد کلائنٹ چیز لینے سے گریزاں ہو، یا اقساط کی ادائیگی نہ کرے، یا دیوالیہ ہو جائے تو بینک کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی اس رقم سے کی جا سکے جس سے یہ معاملہ سادہ وعدے کی حد تک نہیں رہتا بلکہ معاہدے کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے، البتہ اس نے نافذ العمل مستقبل کی تاریخ پر ہونا ہے اور جب یہ معاہدہ ہے تو گویا بینک نے ملکیت میں لانے سے قبل ہی اجارہ پر دینے کا معاہدہ کر لیا، جو اجارہ قوانین کی صریحا خلاف ورزی ہے۔

چنانچہ مصر کے ممتاز دینی سکالر و ماہر اسلامی معاشیات ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں۔

'فاذا لم يكن الوعد ملزما فهذا لابأس فيه أما اذا كان ملزما فان

العملية تدخل في نطاق بيع مالا يملك ،أو البيع قبل القبض،بل قبل الشراء ،و هذا غير جائز شرعا'

''جب وعدہ لازمی نہ ہوتو اس میں کوئی حرج نہیں۔لیکن جب وعدہ لازم ہوتو یہ کارروائی غیر ملکیتی چیز کی بیع یا قبضہ سے بلکہ خریداری سے قبل بیع کے دائرے میں داخل ہوجاتی ہے اور یہ شرعاً ناجائز ہے۔''[1]

اسلامی بینکاری کے حامی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مذکورہ بالا خرابی تب لازم آتی ہے جب دونوں جانب سے وعدہ لازم ہو،جبکہ اسلامی بینکوں میں یہ وعدہ یکطرفہ یعنی صرف کلائنٹ کی طرف سے ہوتا ہے،بینک کو اختیار ہوتا ہے کہ معاملہ کرے یا نہ کرے۔اس کے علاوہ بینک کرایہ بھی اس تاریخ سے لینا شروع کرتا ہے جب مطلوبہ چیز کلائنٹ کے حوالے کردی جاتی ہے،یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مذکورہ وعدہ معاہدہ نہیں ہے،مگر دو وجوہ کے باعث یہ جواب اہل علم کو مطمئن نہیں سکتا۔

1. کہنے کی حد تک تو یکطرفہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں دوطرفہ ہوتا ہے۔کیونکہ وعدۂ اجارہ کے بعد کلائنٹ کو سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ بینک اسے ضرور مطلوبہ چیز مہیا کرے گا۔مروجہ اسلامی بینکوں کی تاریخ میں بمشکل اِکا دُکا ہی ایسے واقعات ملیں گے جن میں بینک نے وعدہ اجارہ پر دستخط کے بعد کلائنٹ کو مطلوبہ چیز کی فراہمی سے انکار کیا ہو،کیونکہ اس سے بینک کی ساکھ خراب ہوسکتی ہے۔جب بینک کی طرف سے مطلوبہ چیز کی فراہمی یقینی ہے تو ''المعروف کالمشروط'' ''جو بات معروف ہو وہ مشروط جیسی ہے'' کے تحت عملی طور پر بینک کی طرف سے بھی لازمی وعدہ ہوا۔اور یہ بات اسلامی بینکاری کے حامی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دوطرفہ لازمی وعدہ معاہدے کے حکم میں ہے۔[2]

---

[1] المصارف الاسلامية 36.

[2] المعايير الشرعية 142، 151.

2. بینک کو معاملہ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دینا اور کلائنٹ کو ہر صورت اس کے ساتھ معاملہ کرنے کا پابند بنانا امتیازی سلوک ہے جو نام نہاد اسلامی بینکوں کے غیر منصفانہ مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ فریقین کو معاملہ کرنے یا نہ کرنے کا حق مساوی حاصل ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری رقمطراز ہیں۔

'انی أری ضرورة الخیار لکلا المتواعدین، أما الخیار لأحدهما فقط فهو تحکم'

''میرے خیال میں دونوں وعدہ کرنے والوں کو اختیار ہونا چاہیے۔ فقط ایک کو اختیار دینا سینہ زوری ہے۔''[1]

باقی رہی یہ بات کہ بینک کلائنٹ کو قبضہ دینے کی تاریخ سے کرایہ لینا شروع کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس سے پہلے اجارہ کا معاہدہ بھی نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ معاہدہ مطلوبہ چیز پر کلائنٹ کے قبضہ کی تاریخ سے مؤثر ہو رہا ہے۔ غرض یہ کہ مطلوبہ چیز کی خریداری سے قبل بینک کا کلائنٹ سے اجارہ کا عدالتی طور پر لازم وعدہ لینا حقیقت میں معاہدہ اجارہ ہے جو شریعت کے منافی اور اجارہ قوانین سے متصادم ہونے کی بنا پر ناجائز ہے۔

اسی طرح اجارہ کے باضابطہ معاہدے کے موقع پر کلائنٹ سے یہ وعدہ لینا بھی خلاف شرع ہے کہ وہ مختلف شقوں کی خلاف ورزی کے باعث بینک کی طرف سے اجارہ ختم کرنے کی صورت میں طے شدہ قیمت پر گاڑی خریدنے کا پابند ہوگا۔

سیکورٹی ڈپازٹ کا حکم

شرعی اعتبار سے سیکورٹی ڈپازٹ کی حیثیت کیا ہے؟ اس سوال کا شافی جواب مروجہ اسلامی بینکوں کے شریعہ ایڈوائزرز کے پاس بھی نہیں ہے کیونکہ وہ خود بھی اس پر مطمئن نہیں ہیں۔ یہی وجہ

---

[1] المصارف الاسلامية 32.

ہے کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ رقم بینک کے پاس امانت ہے بینک اس میں تصرف کا مجاز نہیں ۔کبھی اسے قرض قرار دیا جاتا ہے،اور کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ رقم پیشگی کرایہ ہے یعنی کرائے کے دو حصے ہوتے ہیں ایک حصہ ماہانہ اقساط کی صورت میں لیا جاتا ہےاور دوسرا حصہ سیکورٹی ڈپازٹ کے نام پر کل مدت اجارہ کے مقابلے میں پیشگی وصول کرلیا جاتا ہے۔

لیکن ان توجیہات میں سے کوئی توجیہ بھی ایسی نہیں جو دینی اعتبار سے قابل اعتراض نہ ہو۔امانت قرار دینے پر یہ اعتراض اٹھتا ہے کہ امانت سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ۔نیز مالک جب چاہےاپنی امانت واپس لے سکتا ہے جبکہ بینک سیکورٹی ڈپازٹ کی رقم سے فائدہ بھی اٹھاتا ہےاور مالک کی حسب منشاء واپس بھی نہیں کرتا۔

قرض قرار دینے سے یہ قباحت پیدا ہوتی ہے کہ اس طرح قرض اور بیع کا معاملہ جمع ہو جاتے ہیں کیونکہ کلائنٹ بینک کو یہ قرض اس شرط پر دیتا ہے کہ بینک اسے اجارہ کی سہولت فراہم کرے یہ منع ہے جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے۔مزید یہ کہ قرض کے بدلے حاصل ہونے والا ہر فائدہ سود ہے جبکہ یہاں ہمیشہ کرایہ سیکورٹی ڈپازٹ کی رقم کو مدنظر رکھتے ہوئے مقرر کیا جاتا ہے۔اگر سیکورٹی ڈپازٹ کی رقم بینک کی فرمائش سے زائد ہوتو کرایہ کم رکھا جاتا ہے،یوں اس میں سود کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔

سیکورٹی ڈپازٹ کو پیشگی کرایہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ رقم وعدہ اجارہ کے موقع پر لی جاتی ہے جو کہ اسلامی بینکوں کے بقول معاہدہ نہیں ہےاور اجارہ قوانین کے مطابق پٹہ دہندہ کو پیشگی کرایہ کی وصولی کا حق معاہدہ اجارہ کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔لہذا سیکورٹی ڈپازٹ کی رقم کو پیشگی کرایہ قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ اس سے اسلامی بینکوں کے اس موقف کی نفی ہوتی ہے کہ اجارہ کا حتمی معاہدہ مطلوبہ چیز کی خریداری کے بعد ہوتا ہے۔

کلائنٹ کو وکیل بنانا

کلائنٹ کو وکیل بنانے کا مطلب ہے کہ گویا بینک نے رقم دی اور رقم ہی واپس لی اور اس پر

طے شدہ منافع لیا، عملاً کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ چونکہ یہ تکنیک سودی لین دین کے ساتھ واضح مشابہت ومماثلت رکھتی ہے اور رفتہ رفتہ خالص سود کے رواج کا سبب بن سکتی ہے اس لئے یہ کسی صورت جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں۔

'غیر أن امکان توکیل المصرف عمیله بشراء المعدات و وعده بهبتها عند انتهاء مدة الاجارة تشم منهما رائحة الحیل فالعملیة تمویل فی حقیقتها واجارة و هبة فی شکلیتها'

''علاوہ ازیں اثاثہ جات کی خریداری کے لئے بینک کا کلائنٹ کو وکیل بنانا اور مدت اجارہ کے اختتام پر ہبہ کا وعدہ ان دونوں سے (سودی) حیلے کی بو آتی ہے۔ کیونکہ یہ کارروائی حقیقت میں فنانسنگ ہے اور بظاہر اجارہ اور ہبہ ہے۔''[1]

اتنی بات تو اسلامی بینکاری کے حامی علماء بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب ممکن ہو تو بہتر یہی ہے کہ کلائنٹ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو خریداری کے لئے وکیل مقرر کیا جائے تاکہ سودی شبہ سے دور رہا جائے اور کارروائی میں مالیاتی ادارے کا بھی کوئی کردار واضح ہو۔[2]

ہمارے خیال میں جب کلائنٹ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو ایجنٹ مقرر کرنے کا بنیادی مقصد سودی شبہ سے بچنا اور لین دین میں بینک کا عملی کردار سامنے لانا ہے تو پھر اس کو صرف بہتر کے درجے میں رکھنا ہی کافی نہیں بلکہ واجب کہنا چاہیے، اور کلائنٹ کو وکیل بنانے کی تکنیک سختی سے مسترد کر دینی چاہیے کیونکہ سود کے معاملے میں شبہ سود کا حکم بھی شرعی طور پر حقیقی سود جیسا ہے۔ نیز اسلامی نظام معیشت کے خصائص، روائتی لیزنگ اور اسلامی اجارہ کے درمیان حقیقی فرق اجاگر کرنے اور سودی حیلوں کی روک تھام کیلئے بھی اس تکنیک پر مکمل پابندی بے حد ضروری ہے۔

---

① المصارف الاسلامیة ص 37.

② المعاییر الشرعیة: ص136، 147.

شرح سود کو معیار بنانا

مزید برآں اسلامی بینکوں کا اپنے منافع اور کرائے کے تعین کیلئے سودی فارمولے اور مروجہ شرح سود کو معیار بنانا بھی قابل اعتراض پہلو ہے۔اس سلسلے میں اسلامی بینکوں کے تائید کنندگان کا نقطۂ نظر نہایت کمزور ہے جس کی کوئی صاحب بصیرت حمایت نہیں کر سکتا۔اس کے حق میں کوئی دلیل تو پیش نہیں کی جاتی البتہ ایک فرضی مثال بیان کر کے اس کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے وہ مثال یہ ہے۔

''زید اور خالد دو بھائی ہیں۔زید لوگوں کو سود پر قرض دیتا ہے جبکہ خالد گارمنٹس کا کاروبار کرتا ہے۔ خالد یہ کہتا ہے کہ میں اپنے گارمنٹس کے کاروبار سے کم از کم اتنا منافع ضرور حاصل کروں گا جتنا میرا بھائی زید سود لیتا ہے۔چنانچہ وہ اپنی اشیاء پر زید کی شرح سود کے مطابق نفع لے کر آگے فروخت کرتا ہے۔اگرچہ خالد کے لئے ایسا کرنا پسندیدہ نہیں لیکن اگر وہ خرید وفروخت کی تمام شرائط پوری کر رہا ہے تو اس کے کاروبار کو محض اس لئے ناجائز نہیں کہا جائے گا کہ اس نے شرح سود کو معیار بنایا ہے۔اسی طرح اگر روائتی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی شرح سود کے مطابق کرایہ لیں تو یہ ناجائز نہیں ہوگا۔''[1]

قطع نظر اس بحث سے کہ شریعت اسلامی کے مجموعی مزاج کے مطابق سود کے دلدادہ معاشرے میں منافع کو مروجہ شرح سود کے ساتھ منسلک کرنے کی کوئی گنجائش نکلتی ہے یا نہیں، یا ایک مستقل نظام کی صورت میں اس کے نفاذ سے استیصال سود کی کوششوں میں مدد ملے گی یا کہ ان کو دھچکا لگے گا، ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ خالد زید کی طرح مالیاتی ادارہ بنا کر مالی وسائل مہیا کرنے کا کام نہیں کرتا بلکہ گارمنٹس کی دکان کھولتا ہے جو واقعی تجارت ہے اور اس کا ارادہ بھی

---

① اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ ص131، 132.

تجارت ہی ہے۔ اگر تجارت کی آڑ میں خالد بھی وہی کچھ کرنا شروع کر دے جو زید کر رہا تھا اور علماء اسے جائز قرار دیں تب تو اس استدلال میں کوئی معقولیت نظر آتی لیکن سوائے اس کے کہ زید کی طرح خالد نے بھی اپنے منافع کا معیار شرح سود کو بنالیا ہے دونوں کے کام اور طریق کار میں کوئی مناسبت نہیں۔ جب کہ یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی مالیاتی ادارہ ہے جو اجارہ وغیرہ کے نام پر مالیات کی سہولت فراہم کر کے فائدہ اٹھاتا ہے، حقیقتاً اجارہ کا معاملہ نہیں کرتا۔ جس کی ایک واضح دلیل وہ معاہدہ ہے جو ابتدائی مرحلہ میں ماسٹر فنانسنگ ایگریمنٹ ''اصولی معاہدہ برائے تمویل'' کے عنوان سے بینک اور کلائنٹ کے درمیان طے پاتا ہے۔ جب یہ سرمائے کی سہولت کا معاہدہ ہے تو اس میں مروجہ شرح سود کو معیار بنانا صرف ناپسندیدہ ہی نہیں حرام ہے۔

یہاں یہ نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خالد کا اپنے حلال منافع کیلئے شرح سود کو معیار بنانا ایک انفرادی عمل ہے۔ اگر خالص فقہی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی گنجائش نکلتی بھی ہو تو اس کو ایک مستقل نظام کی حیثیت دینا ہرگز درست نہ ہوگا کیونکہ بعض اوقات انفرادی عمل میں وہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں جو اس کو ایک مستقل نظام کی صورت دینے سے رفتہ رفتہ اس میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح اسلامی بینک کا بکنگ کی تاریخ سے قبضہ (Delivery) تک کی درمیانی مدت یعنی Grace Period میں اس رقم پر حاصل ہونے والے متوقع سود کو اپنی لاگت میں شمار کرنا بھی غلط ہے کیونکہ زر کا متعین ممکنہ نفع سودی تصور ہے جس کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے کہ زر میں اگر نفع کمانے کی صلاحیت ہے تو اسے خسارے کا بھی خطرہ لاحق رہتا ہے اور یہ خطرہ ہی اسے نفع کے قابل بناتا ہے۔

ہم اوپر روائتی لیزنگ کی قباحتوں میں بیان کر آئے ہیں کہ سودی بینک جس وقت رقم فراہم کرتا ہے اسی تاریخ سے کرایہ لینا شروع کر دیتا ہے خواہ کلائنٹ کو گاڑی چند ماہ بعد ملے۔ مروجہ

اسلامی بینکوں کا طریق کار بھی یہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلامی بینک اس کو علیحدہ وصول کرنے کی بجائے اپنے اخراجات میں شمار کر لیتا ہے۔ اگر صرف الگ لینے اور اخراجات میں شمار نہ کرنے کا مسئلہ ہے تو شاید سودی بینکوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔

اسلامی بینک اس عرصہ کا منافع (سود) کس اصول کے تحت اپنی لاگت میں شمار کرتے ہیں اسلامی بینکوں کے محققین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے سوائے اس کے کہ چونکہ فریقین باہمی رضامندی سے کوئی بھی کرایہ مقرر کر سکتے ہیں اس لئے شرعاً بینک کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ دیگر اخراجات کے ساتھ (Grace Period Profit) کا اعتبار کرے۔[1]

لیکن سوال یہ ہے کہ عام اجارہ میں بھی ایسا ہوتا ہے یا نہیں یا خود آپ نے اجارہ کا معاملہ کرتے ہوئے کبھی یہ سوچا پایا ہے کہ چونکہ اس گاڑی کے پیسے میں نے تین ماہ قبل جمع کرائے تھے اور ان تین مہینوں میں مجھے اس رقم پر اتنا سود ملنا تھا اس لئے میں اپنے دیگر اخراجات کے ساتھ ان مہینوں کا سود شمار کر کے اتنا کرایہ لوں گا۔ اگر کسی وقت آپ یہ غلطی کر بھی بیٹھیں تو کلائنٹ دوٹوک الفاظ میں کہے گا کہ مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ جب عام اجارہ میں ایسا نہیں ہے تو آخر آپ اسلامی بینکوں کو یہ پروانہ دینے پر اصرار کیوں کر رہے ہیں؟

نتیجہ بحث

مذکورہ بالا تحقیق وتفصیل سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ اسلامی اجارہ کے اصولوں کی بجائے سودی بینکوں میں رائج لیزنگ کے تصور پر قائم ہے جس کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ مجوزین کی تمام توجیہات وتاویلات حقیقت سے بعید اور خلاف شریعت ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا

---

[1] اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ : ص 160۔

بایں ہمہ مروجہ اسلامی بینکوں کے وکیل اور ترجمان اس بات پر مصر ہیں کہ ہم نے روائتی لیز میں پائی جانے والی خرابیاں دور کر دی ہیں اور ہماری اجارہ مصنوعات اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ جو علماء نکتہ چینی کر رہے ہیں وہ اصل میں بینکنگ سے ناواقف ہیں۔ بینک کا طریق کار کیا ہوتا ہے یہ ناقدین اس معاملے میں بالکل بے علم ہیں، لہٰذا ان کی تنقید معتبر نہیں۔ حالانکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں جتنی زیادہ آگاہی حاصل کی جائے اتنی ہی زیادہ اس کی قباحتیں آشکارا ہوتی چلی جاتیں ہیں۔ اس لئے کہ اسلامی بینک شرعی اصطلاحات مضاربہ، مرابحہ، اجارہ اور مشارکہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں جس سے ان کے معاملات سرسری نظر میں جائز معلوم ہوتے ہیں لیکن جب تعمق نگاہی سے جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کے نقائص کھل کر سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنے کی بجائے یوں کہنا چاہیے جو حضرات مروجہ اسلامی بینکوں کے حامی ہیں ان کی اسلامی بینکوں کے معاملات پر گہری نظر نہیں ہے اس لئے یہ ان کی حمایت کر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اسلامی بینکوں کے معاملات کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہوتا تو انہیں کبھی جائز قرار نہ دیتے۔

صُکُوک (Sukuk) کی شرعی حیثیت

صکوک اسلامی قوانین کے تحت سرمایہ حاصل کرنے کا ایک متبادل ذریعہ ہے کہ جس طرح طویل المیعاد قرضے لینے کیلئے سود پر مبنی بانڈز یا مختلف سرٹیفکیٹس جاری کئے جاتے ہیں اسی طرح جائز طریقے سے رواں سرمائے کی ضروریات کا انتظام کرنے کیلئے صکوک جاری کئے جاتے ہیں جو صرف قرضوں کے بجائے جاری کنندہ ادارے کے کاروباری اور مالی اثاثوں میں ملکیت کے دستاویزی ثبوت ہوتے ہیں۔

صکوک کی تعریف

صکوک ''صَک'' کی جمع ہے جس کے معنی ہے'' دستاویز۔''

قبل ازیں قرض دستاویزات کی خرید وفروخت پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ مروان بن حکم کے دور میں بیت المال سے راشن حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو جو کارڈز جاری کئے جاتے تھے انہیں ''صکوک'' کہا جاتا تھا لیکن صکوک کا جدید مفہوم اس سے مختلف ہے۔ عصر حاضر کے مسلم معیشت دانوں کی اصطلاح میں صکوک کا مطلب ہے:

''وہ تمسکات جو یکساں مالیت کے ہوتے ہیں اور کسی اثاثے یا کسی معلوم اثاثے کے حق استعمال یا فراہم کی جانے والی خدمات (Services) یا کسی متعین پراجیکٹ کے اثاثہ جات یا کسی مخصوص کاروبار میں ملکیت کے متناسب غیر منقسم حصے کی نمائندگی کرتے ہیں۔''[1]

سادہ الفاظ میں یہ سرمایہ کاری سرٹیفکیٹس ہیں۔ بعض لوگ انہیں اسلامی بانڈز کا نام بھی دیتے

[1] المعاییر الشرعیة: ص288، مطبوعه 2007.

ہیں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ بانڈز اور صکوک میں یہ فرق ہے کہ بانڈز صرف قرضوں کی دستاویزات ہیں جبکہ صکوک متناسب حصے کی ملکیت کے ثبوت ہوتے ہیں۔ نیز صکوک میں حاملین صکوک کے منافع کا انحصار ان اثاثہ جات سے حاصل ہونے والی آمدن پر ہوتا ہے جن کی صکوک نمائندگی کرتے ہیں لیکن بانڈز میں منافع طے شدہ ہوتا ہے خواہ جاری کنندہ کو نفع ہو یا نقصان۔ اسی طرح شیئرز اور صکوک میں بھی فرق ہے، وہ یہ کہ صکوک مخصوص مدت مثلاً تین یا پانچ سال کیلئے جاری کئے جاتے ہیں اور شیئرز غیر معینہ مدت کیلئے ہوتے ہیں۔

صکوک کی ابتداء وارتقاء

پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے 1980 میں اپنی مشہور زمانہ بلا سود بنکاری رپورٹ میں مخصوص مدت کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے کے لئے نفع ونقصان میں شراکت کے اصول کی اساس پر ایسی مالیاتی دستاویزات تیار کرنے کی تجویز پیش کی تھی جو ڈی بنچرز کی جگہ لے سکیں۔ اس رپورٹ میں ان کا نام بھی تجویز کر دیا گیا تھا ''حصہ داری کے میعادی سرٹیفکیٹ'' (Participation Term Certificate) مختصراً پی، ٹی، سی کہا جاتا ہے۔ 1984ء میں کونسل کی اس تجویز کے مطابق حصہ داری کے میعادی سرٹیفکیٹ متعارف بھی کرائے دیئے گئے۔ اگرچہ بعض وجوہ کے باعث یہ سرٹیفکیٹ زیادہ عرصہ رائج نہ رہ سکے اور ان کی جگہ ٹرم فنانس سرٹیفکیٹ نے لے لی لیکن ہم انہیں صکوک کے اجراء کی اولین کوشش سے تعبیر کر سکتے ہیں کیونکہ جدید صکوک کا تصور انہی بنیادوں سے ماٴخوذ ہے جن پر پی، ٹی، سی مبنی تھے۔

تاہم باقاعدہ صکوک نام کی مالیاتی دستاویز کا اجراء 2002ء میں ملائشیاء سے ہوا تھا۔ بعد ازاں 2003ء میں اسلامی ترقیاتی بینک جدہ نے صکوک جاری کئے۔ اس کے بعد تو ان کے اجراء کے عمل میں کافی سرگرمی دیکھی گئی تاآنکہ 2008ء میں مولانا تقی عثمانی نے AAOFI کی مجلس شرعی کے صدر کی حیثیت سے مشرق وسطیٰ اور ملائیشیا میں اربوں روپے کے جاری کئے گئے صکوک کی اکثریت کو غیر شرعی قرار دیا تو ان کے اجراء کے عمل میں قدرے کمی آئی تاہم یہ سلسلہ رکا

نہیں بلکہ تاہنوز جاری ہے۔ 2009ء میں پاکستان میں تیس ارب سے زائد مالیت کے صکوک جاری کیئے گئے ہیں۔اسی طرح انڈونیشیا کی حکومت نے بھی اپنے بجٹ خسارے کو پورا کرنے اور فنڈ کے حصول کی خاطر صکوک کا اجراء کیا ہے۔ کہتے ہیں اب تک دنیا کا سب سے بڑا صکوک متحدہ عرب امارات کی پراپرٹی ڈیویلپر نخیل نے جاری کیا ہے جس کی مالیت ساڑھے تین ارب ڈالر ہے۔

عالمی مالیاتی فنڈ (I M F) کی ایک رپورٹ کے مطابق اسلامی مالیاتی مصنوعات میں سب سے زیادہ مقبولیت صکوک کو حاصل ہے۔صکوک کی مقبولیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے متعدد غیر مسلم ممالک بھی اس کے اجراء کے پروگرام پر غور کر رہے ہیں بلکہ گزشتہ سال کے آواخر میں امریکی کارپوریشن جنرل الیکٹرک صکوک جاری کرنے والی پہلی غیر مسلم کمپنی بن چکی ہے اور کمپنی کا کہنا ہے کہ وہ مشرق وسطی اور ایشیا میں متمول افراد کو متوجہ کرنے کے لئے مزید صکوک جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

صکوک کی قسمیں

صکوک کی کئی اقسام ہیں سب سے اہم یہ ہیں۔

1. مشارکہ صکوک: ان سے مراد وہ تمسکات ہیں جو ان منصوبوں یا سرگرمیوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کو شراکت کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک کمپنی کے پاس بہت بڑا منصوبہ ہے جس کی تکمیل کے لئے خطیر رقم درکار ہے، فرض کیجئے دس ارب روپے کی ضرورت ہے جو تنہا کمپنی یا چند افراد مل کر فراہم نہیں کر سکتے ،اب کمپنی دس ارب کے سو سو روپے کی مالیت کے سرٹیفکیٹ بنا کر جاری کر دیتی ہے جنہیں مشارکہ صکوک کا نام دیا جاتا ہے اور جو لوگ یہ سرٹیفکیٹ خریدتے ہیں وہ اس منصوبے میں حصے دار کہلاتے ہیں۔ گویا مذکورہ منصوبہ اب تنہا کمپنی کی ملکیت نہیں رہا بلکہ متعدد لوگوں کی ملکیت بن گیا ہے اور اس سے جو منافع یا آمدن ہوگی وہ طے شدہ فارمولے کے مطابق سب صکوک ہولڈر میں ان کے حصص کے حساب سے تقسیم ہو

گی اور اگر نقصان ہوا تو اس میں بھی سب اپنے اپنے حصے کے مطابق شریک ہوں گے۔
جب صکوک کی مدت پوری ہوگی تو کمپنی ان کو خرید کر دوبارہ تنہا مالک بن جائے گی۔

2. مضاربہ صکوک: یہ وہ تمسکات ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے حامل نے اتنی رقم مضاربہ کی بنیاد پر دی ہوئی ہے۔ یہ صکوک یا تو وہ کمپنیاں جاری کرتی ہیں جو مضاربہ کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرنا چاہتی ہیں، یا پھر ان کا اجراء ان مالیاتی اداروں کی جانب سے ہوتا ہے جنہوں نے مضاربہ پر رقم دے رکھی ہو۔ مثلاً ایک بینک نے پچاس ملین روپے کسی پارٹی کو تین سال کے لئے مضاربہ پر دیئے ہوئے ہیں اور اب وہ چاہتا ہے کہ یہ رقم اسے واپس مل جائے تاکہ اس سے دیگر ضرورتیں پوری کی جاسکیں تو وہ اس رقم کے مساوی مالیت کے سرٹیفکیٹ یعنی مضاربہ صکوک بنا کر فروخت کر دے گا۔ جو لوگ یہ سرٹیفکیٹ خریدیں گے وہ اس مضاربہ سے حاصل ہونے والے منافع میں حصہ دار ہوں گے۔ جب مدت ختم ہوگی تو بینک وہ صکوک دوبارہ خرید لے گا۔

3. اجارہ صکوک: یہ صکوک کی اہم ترین قسم ہے، اس کا اطلاق ان تمسکات پر ہوتا ہے جو کرایہ پر دیئے گئے اثاثوں اور ان کی منفعت (Usufruct) میں متناسب حصہ کی ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان اثاثوں سے جو کرایہ حاصل ہوتا ہے صکوک ہولڈرز اپنے حصص کے تناسب سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ مشارکہ اور اجارہ صکوک میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں شراکت سے حاصل منافع تقسیم ہوتا ہے اور آخیر الذکر میں اثاثہ سے ملنے والا کرایہ تقسیم کیا جاتا ہے۔

اجارہ صکوک کبھی تو اثاثے یا منفعت کا مالک براہ راست خود صکوک جاری کرتا ہے اور کبھی مالیاتی ایجنٹ کے ذریعے یہ کام کرتا ہے۔ یہ مالیاتی ایجنٹ ایک ادارہ ہوتا ہے جو خاص اسی مقصد کے لئے ہی قائم کیا جاتا ہے اس لئے اسے سپیشل پرپز وہیکل (S P V) کا نام دیا جاتا ہے۔

مثلاً حکومت کو سرمائے کی ضرورت ہے اور اس کے پاس ایک بلڈنگ ہے جس کی قیمت ایک

سوملین ہے۔ چنانچہ ایس، پی، وی حکومت کے ایجنٹ کی حیثیت سے اس بلڈنگ کو پانچ سال کیلئے کرایہ پر دے کر اس کی کل قیمت سوملین کے سوسوروپے کے ایک لاکھ سرٹیفکیٹ بنا کر جنہیں اجارہ صکوک کہا جاتا ہے سرمایہ کاری کرنے والے لوگوں میں فروخت کر دیتی ہے یوں حکومت کو پانچ سال کیلئے ایک سوملین کی رقم حاصل ہو جاتی ہے اور اس بلڈنگ سے حاصل ہونے والا کرایہ صکوک ہولڈرز کے حصص کے تناسب سے ان میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جب اجارہ کی پانچ سالہ مدت پوری ہو جائے گی تو ان صکوک کی ادائیگی کے ذریعے ملکیت دوبارہ حکومت کو مل جائے گی۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک بینک نے پچاس ملین کے اثاثے مقررہ مدت کیلئے کرایہ پر دے رکھے ہیں اور اب وہ چاہتا ہے کہ ان اثاثوں کی خریداری پر خرچ ہونے والی رقم اسے حاصل ہو جائے تو وہ ان اثاثوں کی بنیاد پر مخصوص مدت کیلئے اتنی مالیت کے صکوک جاری کر کے مارکیٹ میں فروخت کر دیتا ہے، یوں بینک کو پچاس ملین کی رقم واپس مل جاتی ہے۔ چونکہ صکوک خریدنے کی وجہ سے صکوک ہولڈرز اپنے حصص کے تناسب سے ان اثاثوں کے مالک بن جاتے ہیں اس لئے ان اثاثوں سے جو کرایہ حاصل ہوگا وہ اس میں اپنی ملکیت کے بقدر شریک ہوں گے۔ جب اثاثوں کے اجارہ کی مدت مکمل ہو جائے گی بینک ان صکوک کی ادائیگی کر کے دوبارہ مکمل مالک بن جائے گا۔

چونکہ یہ صکوک حصہ داری کے سرٹیفکیٹ ہوتے ہیں اور ان کی بیع درحقیقت اس حصے کی بیع ہے جو ان کی پشت پر ہوتا ہے اس لئے اگر کوئی صکوک ہولڈر ان کو مقررہ مدت سے قبل کسی تیسرے فریق کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے تو وہ فروخت بھی کر سکتا ہے۔

صکوک کے احکام

صکوک کے اجراء میں کن اصولوں کی پابندی لازم ہے یہ سمجھنے کیلئے ان کی فقہی حیثیت کا تعین ضروری ہے تاکہ اس کو مدنظر رکھ کر ہی احکام ذکر کئے جائیں۔ ہم نے اوپر جو تفصیل بیان کی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ صکوک ہولڈرز کا باہمی تعلق شراکت داری پر مبنی ہوتا ہے، اس

لئے کہ جب تک شراکت داری کا تعلق قائم نہیں ہوگا نہ تو ان صکوک پر منافع لینا جائز ہوگا اور نہ ہی ان کے اوپر لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے کم یا زائد پر ان کی خرید وفروخت صحیح ہوگی کیونکہ اس صورت میں یہ قرض کی دستاویز ہوں گے جن پر کسی قسم کا منافع یا ان کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ سود ہے جس سے ان کے اجراء کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ صکوک کے جاری کنندہ اور حاملین کا باہمی تعلق محدود مدت کی شراکت داری کے تصور پر استوار ہوتا ہے تو پھر ان کو شراکت داری احکام کے تناظر میں ہی دیکھنا چاہیے۔ اسلامی فقہ میں شراکت کے احکام بڑی وضاحت سے بیان ہوئے ہیں یہاں ان کی تفصیل بے محل ہوگی تاہم درج ذیل امور ضرور نگاہ میں رہنے چاہئیں۔

- شراکت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ نفع ونقصان میں تمام فریق شریک ہوں گے، چنانچہ ایسی شراکت جائز نہیں جس میں کوئی فریق منافع میں تو حصہ دار ہو مگر اپنے حصے کے نقصان کی ذمہ داری قبول نہ کرے۔ چونکہ صکوک ہولڈرز ان اثاثوں میں حصہ دار ہوتے ہیں اس لئے انہیں اپنے حصص کے تناسب سے نقصان بھی برداشت کرنا چاہیے۔
- ایسی شراکت جائز نہیں جس میں کسی فریق پر یہ لازم ہو کہ وہ دوسرے فریق کو اصل زر کی نسبت سے طے شدہ منافع ادا کرے گا۔ مثلاً یہ کہا گیا ہو کہ ان صکوک پر بہر صورت بارہ فیصد منافع دیا جائے گا، یہ سود کی تعریف میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔ البتہ شراکت کے آغاز میں یہ طے کیا جانا ضروری ہے کہ حاصل منافع شرکاء کے مابین کس نسبت سے تقسیم ہوگا۔ لہٰذا ایسے صکوک جائز نہیں جن میں حاملین صکوک کی طرف سے لگائے گئے سرمائے (Invested Money) کی فیصد نسبت کے حساب سے منافع طے کیا یا اس کا تأثر دیا گیا ہو۔
- شراکت کے اختتام پر تصفیہ ضروری ہوتا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شراکت سے متعلق تمام اثاثہ جات کو بیچ کر نقد میں تبدیل کرلیا جائے اور ان سے حاصل ہونے والی رقم سے

تصفیہ کے اخراجات اور واجب الادا قرض منہا کر کے باقی رقم تمام حصہ داروں میں ان کے حصص کے تناسب سے تقسیم کر دی جائے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ شراکت سے متعلق اثاثہ جات سب حصہ داروں کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں لہذا شراکت کی مدت ختم ہونے پر تمام شرکاء میں ان کے حصص کے بقدر تقسیم ضروری ہے۔چنانچہ دنیا بھر کے اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کی شرعی رہنمائی کے لئے ترتیب دی گئی دستاویز 'المعاییر الشرعیة' میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے:

''جب شراکت کی مدت ختم ہونے پر تصفیہ ہوتو وہ اس طرح مکمل ہوگا کہ تمام اثاثہ جات کو بازار میں بیچا جائے اور اس سے جو کچھ حاصل ہو وہ اس طرح استعمال میں لایا جائے کہ پہلے تصفیہ کے اخراجات نکالے جائیں، پھر شرکت کے ٹوٹل اثاثوں میں سے مالی ادائیگیاں کی جائیں اور پھر بقیہ اثاثوں میں سے ہر شریک کو اس کے اصل سرمایہ کی مناسبت سے دیا جائے اور اگر اثاثے اصل سرمائے کی واپسی کے لئے ناکافی ہوں تو ہر ایک کو اس کے سرمائے کی نسبت سے حصہ رسدی دے دیا جائے۔''[1]

اس سے پہلے یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ شراکت کا کوئی فریق یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ وہ شراکت کے اثاثہ جات قیمت اسمیہ(Face Value) پر خرید لے گا۔[2]

کیونکہ اس کا مطلب ہوگا کہ ایک شریک کو یہ ضمانت فراہم کر دی گئی ہے کہ اس کا رأس المال لازمی واپس کیا جائے گا اور یہ شراکت کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اجارہ صکوک بھی چونکہ محدود مدت کی شراکت داری کے تصور پر جاری کئے جاتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ جب صکوک کی مدت پوری ہوتو وہ اثاثہ فروخت کیا جائے اور اس سے وصول ہونے والی رقم حاملین صکوک میں ان کے حصص کے تناسب سے تقسیم کی جائے۔

---

① المعاییر الشرعیة ص 199 ، 200.

② المعاییر الشرعیة ص 199.

مروجہ صکوک کا مختصر جائزہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر صکوک کو اس طرح ڈیزائن کیا جائے کہ اس سے کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی نہ ہو تو یہ جائز طریقے سے سرمایہ حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں لیکن جب ہم مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں مروجہ صکوک کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں درج ذیل خرابیاں نظر آتی ہیں۔

1. حاملین صکوک صرف منافع یا کرایہ وصول پاتے ہیں، نقصان میں حصے دار نہیں ہوتے جو کہ خلاف شریعت ہے۔
2. لگائے گئے سرمائے پر فیصد کے حساب سے طے شدہ منافع دیا جاتا ہے جو کہ سود کے زمرہ میں آتا ہے۔
3. مدت کے اختتام پر اثاثہ جات کا تصفیہ نہیں کیا جاتا بلکہ جاری کنندہ اوپر لکھی ہوئی قیمت (Face Value) کے عوض دوبارہ خرید لیتا ہے۔ یہ شراکت کے تصور کے منافی ہے۔

اسلام کا نظریہ زر اور کاغذی کرنسی کی حقیقت

چونکہ لوگوں کے مابین لین دین کے تمام معاملات میں مرکز ومحور زر ہی ہوتا ہے اس لئے ہر معاشی نظام میں زر اور اس کے متعلقات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ زر کی اس اہمیت کے پیش نظر علمائے اسلام نے بھی اپنی تحریری کاوشوں میں اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسلام کے قرون اولی میں قانونی زر سونے، چاندی کے سکوں (دنانیر ودراہم) کی شکل میں ہوتا تھا مگر دور حاضر میں تمام ممالک کے مالیاتی نظام کی اساس کاغذی کرنسی ہے، سونے چاندی کے سکے پوری دنیا میں کہیں استعمال نہیں ہوتے۔ اسلامی نقطہ نظر سے زر کی حقیقت اور مروجہ کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ذیل میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

زر کی تعریف

زر کو عربی میں نَقْد کہتے ہیں۔

لغت کی مشہور کتاب المعجم الوسیط میں نقد کا معنی یوں لکھا ہے۔

'النقد (فی البیع) خلاف النسیئة و یقال : درهم نقد : جید لا زیف فیه (ج) نقود . والعملة من الذهب أو الفضة و غیر هما مما یتعامل به و۔ فن تمیز جید الکلام من ردیئه ،و صحیحه من فاسده'

''خرید وفروخت میں نقد کا معنی ہوتا ہے جو ادھار نہ ہو، عمدہ قسم کا درہم جس میں کھوٹ نہ ہو کو ''درہم نقد'' کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع نقود آتی ہے۔ اور نقد اس کرنسی کو کہتے ہیں جس کے ذریعے لین دین ہوتا ہو خواہ سونے کی بنی ہو یا چاندی کی یا ان دونوں کے علاوہ کسی دوسری چیز سے۔ عمدہ اور ردی، صحیح اور فاسد کلام کے مابین امتیاز کرنے کے

فن کو بھی نقد کہتے ہیں۔"

فقہی لٹریچر میں نقد کا لفظ تین معانی کیلئے آتا ہے۔

1. سونے چاندی کی دھاتیں خواہ وہ ڈلی کی شکل میں ہوں یا ڈھلے ہوئے سکوں کی صورت میں۔ چنانچہ فقہاء کی عبارات میں سونے چاندی کیلئے النقدان کا لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے۔
2. سونے چاندی کے سکوں کیلئے چاہے وہ عمدہ ہوں یا غیر عمدہ۔سونے چاندی کے علاوہ کسی دوسری دھات سے بنے ہوئے سکوں کو فُلُوس کہتے ہیں۔اس معنی کے مطابق فلوس نقد میں شامل نہیں۔
3. ہر وہ چیز جو بطور آلہ تبادلہ استعمال ہو چاہے وہ سونے کی ہو یا چاندی، چمڑے پیتل اور کاغذ وغیرہ کی بشرطیکہ اس کو قبولیت عامہ حاصل ہو۔عصر حاضر میں نقد کا لفظ اس تیسرے معنی کیلئے ہی استعمال ہوتا ہے۔[1]

چنانچہ اقتصادی ماہرین نقد (زر) کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

'إن للنقد ثلاث خصائص متى توفرت في مادة ما اعتبرت هذه المادة نقدا الأولى أن يكون وسيطا للتبادل،الثانية أن يكون مقياسا للقيم،الثالثة أن يكون مستودعا للثروة'

"زر کی تین خصوصیات ہیں جس مادہ میں بھی وہ پائی جائیں وہ زر شمار ہوگا۔

1. ذریعہ مبادلہ ہو۔
2. قیمتوں کا پیمانہ ہو۔
3. دولت محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہو۔"[2]

---

① الموسوعة الفقهية 41/173 نقود.

② مجلة البحوث الاسلامية: عدد ١ / ص200.

زر کی ضرورت واہمیت

یہ دعویٰ کسی ثبوت کا محتاج نہیں کہ اس کائنات میں ہر شخص اپنے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے خرید وفروخت کے معاملات کا محتاج ہے، کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ شخص بھی اس سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب خرید وفروخت کے معاملات انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے تو پھر ایک ایسے آلہ مبادلہ کی ضرورت ہے جس کی مدد سے تمام اشیاء کی قیمتیں مقرر کی جا سکیں کیونکہ یہ فیصلہ کرنا بہر حال مشکل ہے کہ ایک شے کی کتنی مقدار دوسری شے کی صحیح قیمت ہے۔ چونکہ ہر جنس کی مختلف اقسام ہوتی ہیں اس لئے کوئی جنس اس مقصد کے لئے موزوں نہیں ہو سکتی تھی بلکہ کسی مشترکہ معیار کی ضرورت تھی اور وہ مشترکہ معیار زر ہے جس کی بنیاد پر تمام اشیاء کی قیمتیں متعین کی جاتی ہیں۔ چنانچہ مشہور مالکی فقیہ علامہ ابن رشد رحمہ اللہ (۵۲۰.....۵۹۵ھ) فرماتے ہیں:

'أن العدل في المعاملات إنما هو مقاربة التساوي و لذلك لما عسر إدراك التساوي في الأشياء المختلفة الذوات جعل الدينار والدرهم لتقويمها أعني تقديرها'

''معاملات میں عدل (برابری کا نام ہے یا کم ازکم) برابری کے قریب رہنے کا اسی لئے جب مختلف اشیاء میں برابری کا ادراک مشکل ہوا تو درہم ودینار کو ان کی قیمت یعنی ان کی قدر جانچنے کا آلہ مقرر کر دیا گیا۔''[1]

بے شک اس موضوع پر بہت سے اہل علم نے خامہ فرسائی کی ہے لیکن ہمارے نزدیک اس پر سب سے جامع اور دل نشین بحث امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی تالیف احیاء العلوم میں لکھی ہے۔ چنانچہ وہ تخلیق زر کی حکمتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت درہم ودینار کی تخلیق بھی ہے اور ان دونوں ہی

---

[1] بداية المجتهد ج 2، ص 107.

سے زندگی قائم ہے، اور یہ دونوں ایسے پتھر ہیں جن کی اپنی کوئی افادیت نہیں ہے لیکن سب لوگ ان کے محتاج ہیں، وہ اس طرح کہ ہر شخص اپنی خوراک، لباس اور دیگر ضروریات کے سلسلے میں بہت سی چیزوں کا محتاج ہوتا ہے، اور بسا اوقات اس کے پاس وہ چیز موجود نہیں ہوتی جس کی اسے ضرورت ہوتی ہے البتہ وہ چیز ہوتی ہے جس کی اسے ضرورت نہیں ہوتی مثلاً ایک شخص کے پاس زعفران ہے اور وہ سواری کا محتاج ہے اور ایک دوسرے شخص کے پاس اونٹ ہے جس کی اسے ضرورت نہیں البتہ اسے زعفران کی ضرورت ہے، لہٰذا دونوں کے درمیان تبادلہ ضروری ہے۔ اور معاوضہ کی مقدار کا اندازہ بھی ناگزیر ہے کیونکہ بعض اوقات اونٹ کا مالک زعفران کی ساری مقدار کے عوض بھی اپنا اونٹ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا، زعفران اور اونٹ کے درمیان کوئی مناسبت بھی نہیں ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ وزن یا صورت میں اس کی مثل دے دیا جائے۔ یہی صورت اس شخص کو پیش آ سکتی ہے جو کپڑوں کے بدلے گھر یا موزے کے بدلے غلام یا گدھے کے عوض آٹا خریدتا کیونکہ ان اشیاء میں کوئی تناسب نہیں ہے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ اونٹ زعفران کی کتنی مقدار کے مساوی ہے تو اس طرح باہمی لین دین کے معاملات بہت زیادہ مشکل ہو جاتے۔ اس لئے یہ مختلف اشیاء اپنے درمیان کسی ایسے واسطہ کی محتاج ہیں جو ان کے مابین منصفانہ فیصلہ کر سکے اور اس کے ذریعے ہر ایک کی قدر و منزلت معلوم کی جا سکے...... چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تمام اموال کی قدر کی پیمائش کے لئے درہم و دینار کو حاکم اور درمیانی واسطہ کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔"[1]

آں رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

'لحكمة أخرى وهي التوسل بهما إلى سائر الأشياء لأنهما عزيزان

---

[1] احیاء علوم الدین: فصل فی الشکر، بیان تمییز ما یحبه الله تعالی۔

في أنفسهما ولا غرض في أعيانهما ونسبتهما إلى سائر الأحوال نسبة واحدة فمن ملكهما فكأنه ملك شيء لا كمن ملك ثوباً فإنه لم يملك إلا الثوب'

''ان میں ایک اور حکمت بھی پنہاں ہے وہ یہ کہ یہ دونوں باقی تمام اشیاء کے حصول کا ذریعہ ہیں کیونکہ یہ دونوں ذاتی طور پر پسند کیے جاتے ہیں تاہم ان کی ذاتی کوئی افادیت نہیں اور تمام اشیاء کے ساتھ ان کی ایک ہی نسبت ہے چنانچہ جو ان کا مالک ہے وہ گویا ہر چیز کا مالک ہے اس کے برخلاف جس کے پاس کپڑا ہے تو وہ صرف ایک کپڑے کا مالک ہے۔''

زر کی قسمیں

زر کی مندرجہ ذیل دو قسمیں ہیں۔

1. حقیقی
2. اعتباری

حقیقی زر کا اطلاق سونے، چاندی پر ہوتا ہے۔ سونے چاندی کے علاوہ زر کی باقی تمام اقسام خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں اعتباری زر کہلاتی ہیں۔ سونے چاندی کو حقیقی زر اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کی قوت خرید فطری ہے اگر بحیثیت زر ان کا رواج ختم بھی ہو جائے تب بھی باعتبار جنس ان کی ذاتی مالیت برقرار رہتی ہے۔ لیکن اگر اعتباری زر کی زری حیثیت ختم ہو جائے تو سونے چاندی کی طرح اس کی افادیت باقی نہیں رہتی۔ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ یہ زر ہیں۔

زر اور کرنسی میں فرق

کرنسی کے مقابلے میں زر اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے کیونکہ اس میں کرنسی کے علاوہ

دوسری اشیاء بھی شامل ہیں جن کو معاشرے میں آلہ مبادلہ کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔اس کے بر عکس کرنسی کا اطلاق صرف کاغذی زر اور دھاتی سکوں پر ہوتا ہے۔اسی طرح کرنسی کو ادائیگیوں کیلئے قانونی طور پر قبول کرنا لازم ہوتا ہے جبکہ عام زر میں یہ پابندی نہیں ہوتی تاہم اس اعتبار سے دونوں ایک ہیں کہ زر کی طرح کرنسی بھی آلہ مبادلہ کی حیثیت سے استعمال ہونے کے علاوہ اشیاء کی قیمتوں کا تعین کرتی اور قابل ذخیرہ ہوتی ہے۔

زر کی حقیقت

دور جدید کے لال بجھکڑ معیشت دان بڑی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ زر کو جنس (Commodity) کا درجہ دینا خطرناک نتائج واثرات کا حامل ہے لہٰذا جب تک کرنسی کو قابل تجارت اشیاء سے خارج کر کے آلہ مبادلہ ہونے تک محدود نہیں کیا جاتا تب تک معیشت کو صحیح راستے پر گامزن کرنے کے لئے جاری کوششوں کے کامیاب اور ثمر آور ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس حقیقت کی نشاندہی چودہ صدیاں قبل ہی فرمادی تھی جب آپ نے دینار کے بدلے دینار اور درہم کے بدلے درہم کے لین دین میں کمی بیشی کو سود قرار دے کر اس پر پابندی عائد کی تھی:

'عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ : الدِّينَارُ بِالدِّينَارِ لَا فَضْلَ بَيْنَهُمَا وَالدِّرْهَمُ بِالدِّرْهَمِ لَا فَضْلَ بَيْنَهُمَا'

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دینار کے ساتھ دینار کے تبادلے میں اضافہ جائز نہیں اور اسی نہ ہی درہم کے ساتھ درہم کے تبادلے میں اضافہ درست ہے۔''[1]

'أَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تَبِيعُوا الدِّينَارَ

[1] صحيح مسلم باب الصرف و بيع الذهب.

بِالدِّينَارَيْنِ وَلَا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَيْنِ'

''حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا: کہ تم ایک دینا دو دینار اور ایک درہم دو درہم کے عوض فروخت نہ کرو۔''[1]

ظاہر ہے جب کمی بیشی ممنوع ہوگی تو پھر سمجھ بوجھ رکھنے والا کوئی شخص بھی خرید وفروخت کے تکلف میں نہیں پڑے کرے گا کیونکہ تجارت تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اس سے یہ حقیقت نصف النہار کی طرح روشن ہے کہ شریعت اسلامیہ میں زر کی تجارت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ زر کو آلہ تبادلہ کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنے کو کفران نعمت اور ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں:

''اور جو شخص درہم و دینار پر سود لیتا ہے وہ نعمت کی ناقدری اور ظلم کرتا ہے کیونکہ ان دونوں کو دوسری اشیاء کے حصول کی غرض سے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ خود اپنے لئے۔ چنانچہ جو شخص ان میں تجارت کرتا ہے تو اس نے ان کو تخلیق کی حکمت کے خلاف مقصود بنا لیا کیونکہ زر کو اس مقصد کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لئے استعمال کرنا ظلم ہے۔''[2]

اس بات پر سب معیشت دان متفق ہیں کہ معیشت کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ غیر فعّال سرمایہ (Dead Money) کم سے کم اور فعّال سرمایہ (Actide Money) زیادہ سے زیادہ ہو، جبکہ زر کی تجارت کی وجہ سے سرمائے کی گردش کا عمل بری طرح متاثر ہوتا اور دولت چند ہاتھوں میں مقید ہو جاتی ہے جس کے معاشی شرح نمو (Economic Growth Rate) پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ چنانچہ امام غزالی زر کی خرید وفروخت کے مضمرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تو جس کے پاس زر ہے اگر اس کے لئے یہ جائز ہو کہ وہ اسے زر کے عوض بیچ دے

---

[1] مؤطا امام مالك باب بيع الذهب الفضة تبرا، صحيح مسلم باب الربا .

[2] احياء العلوم: فصل في الشكر، بيان تمييزما يحبه الله تعالى .

اور اسی کو اپنا کاروبار بنالے تو زر اس کے پاس مقید ہو کر رہ جائے گا اور جمع شدہ خزانے کی مانند ہو جائے گا......اور زر کو زر کے بدلے بیچنے کا معنی یہی ہے کہ زر کو ذخیرہ کا مقصد ٹھہرالیا جائے جو کہ ظلم ہے۔''

یہاں یہ بات بہر حال ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ زر کی خرید وفروخت صرف اسی صورت میں منع ہے جب جنس ایک ہو لیکن جب جنس مختلف ہو جیسے دینار کا درہم کے ساتھ تبادلہ تو پھر یہ بلا شبہ جائز ہے جیسا کہ خود امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''اگر تم یہ کہو کہ پھر ایک دینار کا درہم سے تبادلہ اور درہم کے بدلے اسی قسم کے درہم لینا کیوں جائز ہے؟ تو جان لیجئے! آلہ مبادلہ ہونے کے اعتبار سے ایک زر دوسرے زر سے مختلف ہے کیونکہ جو مقصد ایک سے حاصل ہوتا ہے وہ دوسرے سے حاصل نہیں ہوتا جیسے دینار کے درہم بنائے جائیں تو اس سے تھوڑی تھوڑی بہت سی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں (یعنی ایک زر کی قوت خرید دوسرے کی قوت خرید سے مختلف ہے)۔لہذا اس پر پابندی سے خلل واقع ہوگا یعنی دوسری اشیاء کے حصول کا آسان ذریعہ باقی نہیں رہے گا۔اور درہم کا اسی قسم کے درہم سے تبادلہ اس لئے صحیح ہے کہ اس میں کسی عاقل کو دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی تاجر اس کام کو اختیار کرتا ہے کیونکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی درہم زمین پر رکھ کر دوبارہ اٹھالے۔ ہمیں عقلمندوں کے بارے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ وہ اس میں اپنا وقت صرف کریں گے لہذا جس کام میں لوگ رغبت نہیں رکھتے ہم اس سے منع بھی نہیں کرتے۔''[1]

دو مختلف کرنسیوں کے باہم تبادلہ کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

کیا زر سونے، چاندی کا ہونا ضروری ہے؟

بلا شبہ اسلام کے ابتدائی ادوار میں مالیاتی لین دین سونے، چاندی کے سکوں کے ذریعے ہی

[1] ایضاً.

ہوتا تھا اور سونے ، چاندی کی زری صلاحیت بھی مسلمہ ہے لیکن شریعت نے زر کیلئے سونے ، چاندی کے سکوں کی شرط نہیں لگائی بلکہ اس معاملے میں بڑی وسعت رکھی ہے۔ مشہور مؤرخ احمد بن یحیٰی بلاذری کے بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اونٹوں کی کھال سے درہم بنانے کا ارادہ کر لیا تھا مگر اس خدشے سے ارادہ ترک کر دیا کہ اس طرح تو اونٹ ہی ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ بلاذری نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

'هممت أن أجعل الدراهم من جلود الابل فقيل له إذالابعيرفأمسك'

''میں نے اونٹوں کے چمڑوں سے درہم بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ ان سے کہا گیا تب تو اونٹ ختم ہو جائیں گے اس پر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔''[1]

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

'لو أن الناس أجازوا بينهم الجلود حتى تكون لها سكة وعين لكرهتها أن تباع بالذهب والورق نظرة'

''اگر لوگ اپنے درمیان چمڑوں کے ذریعے خرید وفروخت کو رائج کر دیں یہاں تک کہ وہ چمڑے ثمن اور سکہ کی حیثیت اختیار کر جائے تو میں سونے چاندی کے بدلے ان چمڑوں کو ادھار فروخت کرنا پسند نہیں کروں گا۔''[2]

یعنی اگر چمڑا بحیثیت زر رائج ہو جائے تو اس پر بھی وہی احکام جاری ہوں گے جو درہم ودینار پر ہوتے ہیں۔

علامہ ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ خراسان کے امیر غطریف بن عطاء کندی کی طرف منسوب غطارفہ نامی دراہم جن میں ملاوٹ زیادہ اور چاندی کم ہوتی تھی کی بحث میں رقمطراز ہیں۔

'وَذَكَرَ الْوَلْوَالِجِيُّ أَنَّ الزَّكَاةَ تَجِبُ فِي الْغَطَارِفَةِ إِذَا كَانَتْ مِائَتَيْنِ ؛

---

[1] فتوح البلدان ج 3، ص 578.

[2] المدونة الكبرى ـ التأخير فی صرف الفلوس.

لِأَنَّهَا الْيَوْمَ مِنْ دَرَاهِمِ النَّاسِ وَإِنْ لَمْ تَكُنْ مِنْ دَرَاهِمِ النَّاسِ فِي الزَّمَنِ الْأَوَّلِ وَإِنَّمَا يُعْتَبَرُ فِي كُلِّ زَمَانٍ عَادَةُ أَهْلِ ذَلِكَ الزمان'

''ولوالجی نے ذکر کیا ہے کہ غطارفہ جب دوسو ہوں تو ان میں زکوۃ واجب ہوگی کیونکہ اگرچہ پہلے زمانے میں یہ لوگوں کے درہم نہیں تھے مگر آج کل یہی ہیں۔ ہر دور میں اس زمانے کا رواج معتبر ہوتا ہے۔''[1]

اس سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ شرعی لحاظ سے زر کے انتخاب میں سونے چاندی کی پابندی نہیں ہے' قیمتوں کو جانچنے کیلئے کسی بھی چیز کو معیار بنایا جاسکتا ہے بشرط کہ اسے معاشرہ میں قبولیت حاصل ہو۔

زر صرف حکومت جاری کرسکتی ہے

اگرچہ شریعت نے زر کے انتخاب میں کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی تاہم زر جاری کرنے کا اختیار صرف حکومت کو دیا ہے کیونکہ مالیاتی لین دین کا مکمل نظام زر کی اساس پر ہی رواں دواں ہے اور اگر ہر کس و ناکس کو حسب منشاء زر جاری کرنے کی اجازت دے دی جائے تو اس سے نہایت خطرناک اقتصادی اور معاشی حالات پیدا ہو جائیں گے۔ چنانچہ کویت کے فقہی انسائیکلو پیڈیا میں ہے۔

'ولا يجوز لغير الامام ضرب النقود لان في ذالك افتياتا عليه ويحق للإمام تعزير من افتات عليه فيما هو من حقوقه ، وسواء كان ما ضربه مخالفا لضرب السلطان أو موافقا له في الوزن ونسبة الغش وفي الجودة حتى لو كان من الذهب والفضة الخالصين ، قال الإمام أحمد في رواية جعفر بن محمد لا يصلح

[1] البحر الرائق شرح كنز الدقائق باب زكوة المال.

ضرب الدراهم إلا في دار الضرب بإذن السلطان ، لأن الناس إن رخص لهم ركبوا العظائم'

''امام کے علاوہ کسی کو کرنسی بنانے کی اجازت نہیں کیونکہ یہ اس پر ظلم ہے۔اور امام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جو شخص اس کا یہ حق سلب کرے وہ اسے سزا دے خواہ اس کی بنائی ہوئی کرنسی خالص سونے چاندی کی ہی کیوں نہ ہو۔امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ درہم صرف حاکم وقت کی اجازت سے ٹکسال میں ہی بنائے جا سکتے ہیں کیونکہ اگر لوگوں کو اس کی اجازت دے دی جائے تو وہ بڑے مصائب میں مبتلا ہو جائیں گے۔''[1]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

'ويكره أيضا لغير الامام ضرب الدراهم والدنانير وإن كانت خالصة لانه من شأن الامام ولانه لا يؤمن فيه لغشو الافساد'

''امام کے علاوہ کسی کو درہم اور دینار بنانے کی اجازت نہیں چاہے وہ خالص ہی ہوں کیونکہ یہ امام کا حق ہے اور اس دوسرے کو اس لئے بھی اجازت نہیں کہ اس میں جعل سازی اور بگاڑ کا اندیشہ ہے۔''[2]

ثابت ہوا کہ اسلامی نقطہ نظر سے حکومت وقت کے علاوہ کسی کو کرنسی جاری کرنے کا اختیار نہیں کیونکہ اس طرح جعلی کرنسی وجود میں آ سکتی ہے جو موجب فساد ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں کرنسی کے اجراء کا اختیار تو حکومتوں کے ہاتھ میں ہی ہے،البتہ زر سے زر کی تخلیق اور اس کے پھیلاؤ کا اختیار بینکوں کو بھی دیا گیا ہے بلکہ بینکاری نظام میں اس عمل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ قانون کے مطابق بینک اپنے پاس موجود سرمائے کی ایک خاص مقدار ہی قرض دے سکتا ہے اور جب کوئی شخص بینک سے بڑی مقدار میں قرضہ

---

① الموسوعة الفقهية: 14/ 178، 179 .

② المجموع 6/ 11.

لیتا ہے تو بینک اس کو قرض لیا ہوا پورا سرمایہ نقد کی صورت میں قرض نہیں دیتا بلکہ اس کے کھاتہ میں اتنی رقم کا اضافہ کر دیتا ہے۔ یا اگر وہ بینک کا کھاتہ دار نہیں تو اس کا اکاؤنٹ کھول کر چیک بک جاری کر دیتا ہے تاکہ وہ حسب ضرورت چیک کے ذریعے ادائیگی کر سکے، چنانچہ اس طرح بینک کے ڈپازٹ میں مصنوعی اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے بینک سے دس کروڑ روپے قرض لینے کا معاہدہ کیا۔ اب بینک اس کو دس کروڑ روپے نقد دینے کی بجائے اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم درج کر دے گا یا اس کا کھاتہ کھول کر چیک بک جاری کر دے گا۔ قرض لینے والے شخص کے کھاتہ میں یہ رقم درج ہونے یا اس کا کھاتہ کھلنے سے گویا بینک کے ڈپازٹ میں دس کروڑ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب بینک یہی رقم اسی طریقے سے کسی اور کو بھی قرض دے سکتا ہے جس کی وجہ سے بینک کے ڈپازٹ میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح زر کا پھیلاؤ بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں زر کی فراہمی کا حجم بہت بڑا نظر آتا ہے۔ اس عمل کو زر بینک یا کریڈٹ کی تخلیق کہتے ہیں۔ اس ضربی عمل سے جہاں بے بنیاد اور حقیقی معیشت سے بے تعلق زر وجود میں آتا ہے جو معاشی استحکام کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے وہاں زر کی تخلیق کا عمل حکومتی کنٹرول سے نکل کر بینکوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے جو کہ غلط ہے۔

زر مستحکم قدر کا حامل ہونا چاہیے

اسلامی نظام معیشت کا مکمل ڈھانچہ عدل پر قائم ہے یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ان معاملات کو ممنوع قرار دیا ہے جو عدل کے منافی ہیں' چونکہ تمام مالی معاملات درحقیقت زر ہی کے گرد گھومتے ہیں اور کسی مالی معاہدے کے وقوع اور وقت ادائیگی کے درمیان زر کی قوت خرید میں غیر معمولی کمی سے صاحب حق کا متأثر ہونا یقینی ہے جو تقاضا عدل کے خلاف ہے اسی بنا پر بعض مسلم مفکرین افراط زر کو بخس، تطفیف اور ملاوٹ میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی حکومت کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ مناسب حد تک کرنسی کی قدر کو مستحکم رکھے۔ چنانچہ "الموسوعۃ الفقہیہ" میں مرقوم ہے۔

'من المصالح العامة للمسلمين التي يجب على الامام رعايتها المحافظة على استقرار أسعار النقود من الانخفاض ، لئلا يحصل بذلك غلاء الأقوات و السلع و ينتشر الفقر و لتحصل الطمأنية للناس بالتمتع بثبات قيم ما حصلوه من النقود بجهدهم و سعيهم و اكتسابهم ،لئلا تذهب هدرا و يقع الخلل و الفساد'

''مسلمانوں کے مفادات عامہ جن کا تحفظ امام کی ذمہ داری ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ زر کی قیمتوں میں ثبات پیدا کرے تاکہ اس سے خوراک اور اشیاء کی قیمتیں نہ بڑھیں اور غربت میں اضافہ نہ ہو۔اور لوگ اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کیے گئے زر سے فائدہ اٹھانے کے متعلق مطمئن ہوں تاکہ وہ زر رائیگاں نہ جائے اور خلل اور فساد واقع نہ ہو۔''[1]

مشہور فقیہ اور محدث امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

'والثمن هو المعيار الذى به يعرف تقويم الأموال فيجب أن يكون محدودا مضبوطا لا يرتفع ولا ينخفض إذ لو كان الثمن يرتفع وينخفض كالسلع لم يكن لنا ثمن نعتبر به المبيعات بل الجميع سلع وحاجة الناس إلى ثمن يعتبرون به المبيعات حاجة ضرورية عامة وذلك لا يمكن إلا بسعر تعرف به القيمة وذلك لا يكون إلا بثمن تقوم به الأشياء ويستمر على حالة واحدة ولا يقوم هو بغيره إذ يصير سلعة يرتفع وينخفض فتفسد معاملات الناس ويقع الخلف ويشتد الضرر'

''زر ہی وہ معیار ہے جس کے ذریعے اموال کی قیمتوں کی پہچان ہوتی ہے لہٰذا یہ

---

(1) الموسوعة الفقهية الكويتية 41/ 196، 197 مادة نقود.

ضروری ہے کہ یہ متعین اور کنٹرول میں ہو اس کی مالیت میں اتار چڑھاؤ نہ ہو کیونکہ اگر سامان تجارت کی طرح زر میں بھی اتار چڑھاؤ ہو تو ہمارے پاس اشیاء کی قیمت لگانے کیلئے کوئی ثمن (زر) نہیں رہے گا بلکہ سب سامان ہی ہو گا حالانکہ اشیاء کی قیمت لگانے کیلئے لوگ ثمن کے محتاج ہیں۔ اور یہ ایسے نرخ کے ذریعے ممکن ہے جس سے قیمت کی معرفت حاصل ہو اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب اشیاء کی قیمت لگانے کیلئے ایک زر ہو اور وہ ایک ہی حالت پر رہے۔ اور اس کی قیمت کا معیار کوئی دوسری چیز نہ ہو کیونکہ اس صورت میں وہ خود سامان (Commodity) بن جائے گا جس کی قیمت بڑھتی اور کم ہوتی رہتی ہے نتیجتاً لوگوں کے معاملات خراب ہو جائیں گے، اختلاف پیدا ہو گا اور شدید ضرر لاحق ہو گا۔''[1]

یعنی کرنسی ایسی ہونی چاہیے جس کی مالیت میں عام اشیاء کی طرح غیر معمولی کمی واقع نہ ہو بلکہ معقول حد تک مستحکم قدر کی حامل ہو تا کہ لوگ ضرر کا شکار نہ ہوں۔

زر کی قدر میں استحکام کیسے لایا جائے؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کاغذی کرنسی کی قدر میں مسلسل کمی کا رجحان چلا آ رہا ہے اور آج کل تو اس کی قدر بہت تیزی سے گر رہی ہے' اس کے برعکس سونے چاندی کی قوت خرید خاصی مستحکم ہے بالخصوص سونے کی قوت خرید میں کوئی غیر معمولی تبدیلی واقع نہیں ہوئی' اگر کسی بحران یا سونے کے مقابلہ میں اشیاء وخدمات کی قلت کی بنا پر ایسا ہوا بھی تو کمی کا یہ سلسلہ مستقل جاری نہیں رہا، بلکہ اس کے اسباب دور ہونے کے بعد صورت اس کے برعکس ہو گئی۔ اگر عہد رسالت میں سونے کی قوت خرید کا اسکی موجودہ قوت خرید سے تقابل کیا جائے تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آئے گا۔ بطور نمونہ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

---

[1] اعلام الموقعین :2/ 156.

❁ قتل کی دیت سو اونٹ ہے اگر کسی کے پاس اونٹ نہ ہوں تو وہ ان کی قیمت ادا کردے جو آپ ﷺ کے دور میں آٹھ سو دینار مقرر تھی۔

'كَانَتْ قِيمَةُ الدِّيَةِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ثَمَانَ مِائَةِ دِينَارٍ'

''رسول اللہ ﷺ کے دور میں دیت کی قیمت آٹھ سو دینار تھی۔''①

اس کا مطلب ہے کہ عہد رسالت میں ایک اونٹ کی قیمت آٹھ دینار تھی۔ جدید تحقیق کے مطابق شرعی دینار کا وزن 4.25 گرام ہے۔②

اس طرح آپ ﷺ کے دور میں ایک اونٹ کی قیمت 34 گرام سونا بنی' آج بھی اتنے سونے کے عوض ایک اونٹ خریدا جاسکتا ہے۔ اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اونٹ گراں ہونے پر دیت کی قیمت آٹھ سو سے بڑھا کر ہزار دینار کردی تھی مگر آج کل ایک سو اونٹ خریدنے کیلئے آٹھ سو دینار یعنی 3400 سو گرام سونا کافی ہے۔

❁ حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

'أَعْطَاهُ النَّبِيُّ ﷺ دِينَارًا يَشْتَرِي بِهِ أُضْحِيَةً أَوْ شَاةً فَاشْتَرَى شَاتَيْنِ فَبَاعَ إِحْدَاهُمَا بِدِينَارٍ فَأَتَاهُ بِشَاةٍ وَدِينَارٍ'

''نبی ﷺ نے ان کو ایک دینار دیا تاکہ وہ اس سے ایک قربانی یا ایک بکری خریدے۔ انہوں نے دو بکریاں خریدلیں پھر ان میں سے ایک کو ایک دینار میں بیچ دیا ایک بکری اور ایک دینار آپ ﷺ کے پاس لے آئے۔''③

یعنی عہد رسالت میں 4.25 گرام سونے کے عوض ایک بکری خریدی جاسکتی تھی' آج بھی

---

① سنن أبي داؤد باب الدية كم هي.

② دیکھیے: الموسوعة الفقهية: مادة دنانير.

③ سنن ابی داؤد باب فی المضارب يخالف۔ سنن ابن ماجه باب الأمين يتجر فيربح .مسند احمد حديث عروة بن أبي الجعد .

سونے کی قوت خرید یہی ہے۔

ان دو مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت سے لے کر اب تک سونے کی قدر میں غیر معمولی کمی نہیں ہوئی، اگر کسی دور میں ایسا ہوا بھی تو بعد میں معاملہ الٹ ہو گیا۔ البتہ اس عرصہ کے دوران سونے کی نسبت چاندی کی قوت خرید میں کافی کمی آئی ہے۔ عہد نبوی میں دس درہم تقریباً تیس گرام چاندی سے ایک بکری خریدی جا سکتی تھی اس کی دلیل وہ روایت ہے جس میں اونٹوں کی زکوۃ کے ضمن میں یہ بیان ہوا ہے۔

'مَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ مِنَ الْإِبِلِ صَدَقَةُ الْجَذَعَةِ ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ جَذَعَةٌ وَعِنْدَهُ حِقَّةٌ ، فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْحِقَّةُ وَيَجْعَلُ مَعَهَا شَاتَيْنِ إِنِ اسْتَيْسَرَتَا لَهُ أَوْ عِشْرِينَ دِرْهَمًا'

''جس کے اونٹوں کی زکوۃ میں جذعہ (چار سالہ اونٹ) فرض ہو اور اس کے پاس جذعہ نہ ہو تو اس سے تین سالہ اونٹ قبول کر لیا جائے گا اور وہ ساتھ دو بکریاں اگر آسانی سے میسر ہوں دے گا یا بیس درہم۔''[1]

یعنی ایک بکری کے بدلے دس درہم۔

لیکن آج کل اتنی چاندی میں ایک بکری نہیں خریدی جا سکتی۔ تاہم اس کمی سے اس قسم کے تباہ کن معاشی حالات پیدا نہیں ہوتے رہے جن سے لوگ کاغذی کرنسی کی وجہ سے دوچار ہیں۔ اس لئے ماہرین معیشت کی رائے میں کاغذی کرنسی کی قدر میں ہوشربا تغیر اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مہنگائی کے طوفانوں کا ایک ہی حل ہے کہ مالیاتی لین دین کی بنیاد سونے، چاندی کو بنایا جائے، چنانچہ آج کل پوری دنیا میں مختلف حلقوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ دوبارہ سونے، چاندی کے سکوں کا نظام رائج کیا جائے۔

ابن مقریزی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی نرخوں میں بے تحاشہ اضافے کا حل یہی ہے کہ از سر نو

---

[1] صحيح البخاري كتاب الزكاة باب من بلغت عنده صدقة بنت مخاض و ليست عنده.

''معیاری قاعدہ زر'' (Gold Specie Standard) کا اجراء کیا جائے۔ چنانچہ کویت کے فقہی انسائیکلو پیڈیا میں ان کی رائے یوں درج ہے۔

''نرخوں میں افراتفری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونی والی مہنگائی کی موجوں کا علاج صرف یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے زر کے استعمال کی طرف لوٹا جائے۔''

ان کے دور میں افراط زر کا جو بحران پیدا ہوا تھا ان کی نظر میں اس کا ایک سبب سونے کی جگہ معدنی سکوں سے لین دین تھا جس سے قیمتیں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ چنانچہ وہ اس پر روشنی ڈالنے کے بعد فرماتے ہیں۔

''اگر اللہ تعالی ان لوگوں کو توفیق دے دیں جن کے سپرد اس نے اپنے بندوں کے امور کر رکھے ہیں یہاں تک کہ وہ لین دین کو سونے کی طرف لے جائیں اور سامان کی قیمتوں اور اجرتوں کے دینار اور درہم سے وابستہ کر دیں تو اس سے امت کا بھلا اور امور کی اصلاح ہوگی۔''[1]

جبکہ جدید ماہرین معیشت کے نزدیک حکومت کا حقیقی پیداوار کو نظر انداز کر کے نوٹ چھاپنا، اشیاء وخدمات کی طلب ورسد کے درمیان عدم توازن، اسراف وتبذیر، تاجروں میں ناجائز منافع خوری کا رجحان اور اشیاء کی پیداواری لاگت میں اضافہ وہ عوامل ہیں جو کرنسی کی قدر میں عدم استحکام پیدا کرتے ہیں' ان مسائل کو حل کر کے کرنسی کی قدر میں استحکام پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ان حضرات کی رائے میں سونے، چاندی کے سکے شرعی تقاضا نہیں ہے۔

علاوہ ازیں سونے، چاندی کے سکوں کی پابندی ریاست کیلئے غیر ضروری زحمت کا موجب بھی بن سکتی ہے' ممکن ہے ریاست کے پاس سکے بنانے کیلئے سونے چاندی کے وسیع ذخائر موجود نہ ہوں۔ البتہ جب افراط زر کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر جائے تو اس کا کوئی معقول حل ہونا چاہیے جیسا کہ علماء کی آراء گزر چکی ہیں۔

---

[1] الموسوعة الفقهية 41 / 48، 49 مادة نقود.

کرنسی کی تاریخ

سونے، چاندی کے بحیثیت زر استعمال ہونے سے قبل دنیا میں ''زر بضاعتی'' یا ''اجناسی زر'' 'النقود السلعیۃ' کا نظام رائج تھا۔ اس سسٹم کے تحت ہر خطے کے لوگوں نے اپنے علاقے میں مقبول اور قیمتی شمار ہونے والی اشیاء کو زر کا درجہ دیا۔ بعض علاقوں میں چاول بعض میں چمڑا اور بعض میں چائے زر کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ چنانچہ معروف سعودی عالم جسٹس ڈاکٹر عبداللہ بن سلیمان منیع لکھتے ہیں۔

''اس نظام میں یہ طے پایا کہ ایسی اشیاء کو زر بضاعتی قرار دیا جائے جن میں حسابی وحدت، قیمتوں کی یکسانیت، بحیثیت مال جمع کیے جانے کی استعداد اور قوت خرید موجود ہو۔ یہ اشیاء نوعیت کے اعتبار سے مختلف تھیں مثلاً ساحلی علاقہ جات میں موتیوں کو بطور ثمن (زر) استعمال کیا گیا۔ سرد علاقوں میں پشم کو ثمن ٹھرایا گیا۔ جبکہ معتدل موسم کے حامل ممالک میں آباد لوگوں کی خوشحال زندگی اور آسودہ حالی کی بنا پر خوبصورت اشیاء (مثلاً قیمتی پتھروں کے نگینے، عمدہ لباس، ہاتھی کے دانت، مچھلیاں وغیرہ) کو کرنسی قرار دیا گیا۔ جاپان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں چاول کو بطور کرنسی استعمال کیا گیا جبکہ وسط ایشاء میں چائے، وسطی افریقہ میں نمک کے ڈلوں اور شمالی یورپ میں پوستین کو کرنسی قرار دیا گیا۔''[1]

رومی بادشاہ جولیئس سیزر (دور حکومت 60 تا 44 ق م) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی فوج کو تنخواہ نمک کی شکل میں ملتی تھی۔ نمک کو لاطینی میں ''سیل'' کہتے ہیں اسی سے لفظ Salary نکلا ہے جس کا معنیٰ ''تنخواہ'' ہوتا ہے۔

چونکہ اشیاء ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہوتا ہے اور ان کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی بھی

---

[1] کاغذی کرنسی کی تاریخ۔ ارتقاء۔ شرعی حیثیت ص:10۔

آسان نہیں ہوتی اس لئے یہ نظام مستقل جاری نہ رہ سکا۔ لوگوں نے اس کی جگہ سونے چاندی کا استعمال شروع کر دیا۔ ابتداء میں سونے چاندی کے وزن کا ہی اعتبار ہوتا تھا۔ سکوں کا رواج بعد میں شروع ہوا۔ سکے کب وجود میں آئے اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے البتہ قرآن مجید سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں دراہم موجود تھے کیونکہ ان کے بھائیوں نے انہیں دراہم کے عوض بیچا تھا۔

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ﴾

''انہوں نے اس کو انتہائی کم قیمت جو گنتی کے چند درہم تھے کے عوض فروخت کر دیا۔''[1]

حضرت یوسف علیہ السلام کا دور 1910 تا 1800 ق م ہے۔

کہتے ہیں سونے کا سکہ سب سے پہلے لیڈیا کے بادشاہ کروسس (دور حکومت 560 تا 546 ق م) نے متعارف کرایا۔

عہد نبوی کی کرنسی

بعثت نبوی کے وقت عرب میں لین دین کا ذریعہ درہم و دینار تھے لیکن گنتی کی بجائے وزن کا اعتبار کیا جاتا۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ درہم و دینار عرب کے مقامی سکے نہ تھے بلکہ ہمسایہ اقوام سے یہاں آتے تھے۔ درہم ساسانی سکہ تھا جو عراق کے راستے عرب پہنچتا اور لوگ اس کی بنیاد پر باہم لین دین کرتے۔ نبی ﷺ نے بھی اس کو برقرار رکھا۔ یہ دراہم چونکہ مختلف وزن کے ہوتے تھے اس لئے جب نصاب زکوۃ کیلئے درہم کا وزن مقرر کرنے کی نوبت آئی تو مسلمانوں نے ان میں سے متوسط کو معیار بنایا چنانچہ اسی کو شرعی درہم سمجھا گیا۔ ایک قول کے مطابق یہ کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جبکہ دوسرے قول کے مطابق بنو امیہ کے دور میں ہوا۔ جو صورت بھی ہوتا ہم آخر کار جس شرعی درہم پر اجماع ہوا وہ وہی ہے جو عبد الملک بن مروان کے دور

[1] یوسف :20.

میں بنایا گیا۔لیکن فقہاء اور مؤرخین نے ثابت کیا ہے کہ یہ درہم اپنی اصلی حالت پر نہیں رہا تھا مختلف شہروں میں اس کے وزن اور معیار میں کافی تبدیلی آتی رہی ہے۔جدید تحقیق کی روشنی میں اس درہم کا وزن 2.975 گرام چاندی ہے۔[1]

اسی طرح دینار رومیوں کی کرنسی تھی جو براستہ شام یہاں آتی نبی ﷺ نے اس کو باقی رکھا حتی کہ خلفاء راشدین اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی رومی دینار کو ہی کرنسی کی حیثیت حاصل رہی۔ جب مسند خلافت عبدالملک بن مروان کے پاس آئی تو انہوں نے زمانہ جاہلیت کے دینار کے مطابق ایک دینار جاری کیا جس کو شرعی دینار کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا وزن اس دینار کے برابر تھا جس کو رسول اللہ ﷺ نے برقرار رکھا تھا۔[2]

معمولی اشیاء کے لین دین میں سونے چاندی کے علاوہ دوسری دھاتوں یعنی تانبے وغیرہ سے بنے سکے جنہیں فُلُوس کہا جاتا ہے،بھی استعمال ہوتے۔

حدیث میں دیوالیہ شخص کے متعلق اَلْمُفْلِس کا لفظ آتا ہے۔شارح بخاری علامہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی مایہ ناز تالیف فتح الباری میں فرماتے ہیں۔

> ''شرعی معنوں میں مفلس وہ شخص ہے جس کے قرضے اس کے پاس موجود مال سے زیادہ ہو جائیں اسے مفلس اس لئے کہا جاتا ہے کہ پہلے درہم و دینار کا مالک تھا لیکن اب فلوس پر آ گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ یہ شخص صرف معمولی مال (فلوس) کا مالک رہ گیا ہے۔

یا ایسے شخص کو مفلس اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس کو فلوس جیسی معمولی چیز میں ہی تصرف کا حق ہوتا ہے کیونکہ وہ فلوس کے ذریعے معمولی اشیاء کا لین دین ہی کرتے تھے۔''[3]

---

[1] الموسوعة الفقهية: 20/ 249.

[2] ایضا : ماده دنانیر

[3] فتح الباری 5/ 79.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں بھی فلوس کا تذکرہ موجود ہے۔

'فَأَمَرَهَا أَنْ تَشْتَرِيَ بِهِ فُلُوساً'

''انہوں نے اپنی لونڈی سے کہا کہ اس کے بدلے ''فلوس'' خرید لو۔''[1]

سونے چاندی کے سکے وجود میں آنے کے بعد بھی بعض علاقوں میں مخصوص اشیاء زر کی حیثیت سے استعمال میں رہیں۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ جب سوڈان گیا تو اس وقت وہاں نمک کے ساتھ ہی لین دین ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

''سوڈان میں نمک بطور روپیہ کے چلتا ہے اور سونے چاندی کا کام دیتا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیتے ہیں اور ان کے ذریعے خرید وفروخت ہوتی۔''[2]

پھر مختلف اسباب کی بنا پر آہستہ آہستہ درہم دینار کا رواج ختم ہوتا چلا گیا اور ان کی جگہ کرنسی نوٹوں نے لے لی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ پوری دنیا میں کرنسی نوٹوں کا ہی دور دورہ ہے کیونکہ یہ آسان ترین ذریعہ مبادلہ ہے۔

نوٹ کب ایجاد ہوئے

کہا جاتا ہے اہل چین نے 650ء سے 800ء کے درمیان کاغذ کے ڈرافٹ بنانے شروع کئے تھے انہی ڈرافٹ نے آگے چل کر کرنسی نوٹوں کی اشاعت کا تصور دیا۔ اسی لئے کاغذ کی طرح کرنسی نوٹ بھی اہل چین کی ایجاد شمار ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں سب سے پہلے کرنسی نوٹ 910ء میں چین میں ایجاد ہوئے۔[3]

ابن بطوطہ جو 1324ء سے 1355ء کے درمیان چین کی سیاحت پر گیا تھا چین کے نوٹوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

---

① مسند احمد بن حنبل 5/ 156.

② سفر نامه ابن بطوطه حصه دوم ص 270.

③ الاوراق النقدية فی الاقتصاد الاسلامی قیمتها و احکامها : ص115.

"اہل چین درہم یا دینار کے ذریعہ سے خرید وفروخت نہیں کرتے بلکہ سونے اور چاندی کو پگھلا کران کے ڈلے بنا کر رکھ چھوڑتے ہیں اور کاغذ کے ٹکڑوں کے ذریعہ سے خرید وفروخت کرتے ہیں یہ کاغذ کا ٹکڑا کف دست (ایک بالشت) کے برابر ہوتا ہے اور بادشاہ کے مطبع میں اس پر مہر لگاتے ہیں ایسے پچیس کاغذوں کو بالشت کہتے ہیں ہمارے ملک میں یہ لفظ دینار کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ جب یہ کاغذ کثرت استعمال سے یا کسی اور طرح پھٹ جاتا ہے تو وہ دارالضرب میں لے جاتے ہیں اور اس کے عوض نیا لے آتے ہیں۔ یہ دارالضرب ایک بڑے درجہ کے امیر کی تحویل میں ہے۔ جب کوئی شخص بازار میں درہم یا دینار لے کر خرید وفروخت کرنے جاتا ہے تو وہ درہم یا دینار نہیں چلتے لیکن وہ درہم یا دینار کے عوض یہ کاغذ لے سکتا ہے اور ان کے عوض جو چیز چاہے خرید سکتا ہے۔"

مشہور مؤرخ ابن مقریزی رحمہ اللہ جب بغداد گئے تھے تو انہوں نے بھی وہاں چین کے نوٹوں کا مشاہدہ کیا تھا۔[1]

چین کے بعد جاپان دوسرا ملک ہے جہاں چودھویں صدی عیسوی میں کرنسی نوٹ جاری ہوئے۔ یورپ میں پہلا باقاعدہ نوٹ 1661ء کوسٹاک ہام بینک آف سویڈن نے جاری کیا۔ انگلینڈ نے 1695ء میں کرنسی نوٹ جاری کیے۔ ہندوستان میں پہلا نوٹ 5 جنوری 1825ء کو بنک آف کلکتہ نے جاری کیا جس کی مالیت دس روپے تھی۔ آزادی کے بعد پاکستان میں کرنسی نوٹ یکم اکتوبر 1948 کو جاری کیے گے۔

ابتداء میں تو نوٹ کی پشت پر سو فیصد سونا ہوتا تھا لیکن بعد میں مختلف معاشی وجوہ کے باعث سونے کی مقدار سے زائد نوٹ جاری کیے جانے لگے اور مختلف ادوار میں یہ تناسب بتدریج کم ہوتا رہا یہاں تک کہ 1971ء سے نوٹ کا سونے سے تعلق بالکل ختم ہو چکا ہے۔

---

[1] الموسوعة الفقهية 41/ 166، 167 مادہ نقود.

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

اب نوٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے اس کے بارہ میں علماء کی مختلف آراء ہیں۔

1. پہلی رائے یہ ہے کہ نوٹ اصل میں اس بات کا دستاویزی ثبوت ہیں کہ حامل نوٹ نے اس نوٹ کے جاری کنندہ سے اتنا سونا یا چاندی وصول پانی ہے اس کے حق میں سب سے مضبوط دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ نوٹ پر یہ الفاظ تحریر ہوتے ہیں۔

"حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا"

اس رائے کے مطابق نوٹوں کے ساتھ سونا چاندی خریدنا جائز نہیں کیونکہ نوٹ کے ساتھ خریداری کا مطلب حقیقت میں اس سونے یا چاندی کے ساتھ خریداری ہے جو اس نوٹ کی پشت پر ہے اور شرعی اعتبار سے سونے کی سونے یا چاندی کی سونے کے ساتھ بیع میں دونوں طرف سے موقع پر قبضہ شرط ہے جو یہاں مفقود ہے کیونکہ خریدار نے سونے کے بدلے سونا نہیں دیا بلکہ اس کی رسید دی ہے۔ چنانچہ تفسیر اضواء البیان کے مصنف علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں۔

'وأنها سند بفضة وأن المبيع الفضة التى هى سند بها ومن المكتوب عليها فهم صحة ذلك ، وعليه فلا يجوز بيعها بذهب ولا فضة ولو يداً بيد لعدم المناجزة بسبب غيبة الفضة المدفوع سندها'

"یہ نوٹ چاندی کی رسید ہیں اور بیچی گئی چیز وہ چاندی ہے جس کی یہ رسید ہیں۔ جو ان پر لکھی عبارت پڑھے گا وہ اس رائے کا درست ہونا سمجھ جائے گا۔ اس رائے کے مطابق نوٹوں کی سونے چاندی کے بدلے بیع چاہے نقد ہو جائز نہیں کیونکہ جس چاندی کی رسید دی جاتی ہے وہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے دونوں طرف سے موقع پر قبضہ کی شرط نہیں پائی جاتی۔"[1]

---

[1] اضواء البيان فى تفسير القرآن بالقرآن ج 1 ، ص 207.

جس طرح اس نقطہ نظر کے مطابق نوٹوں کے بدلے سونا چاندی خریدنا جائز نہیں اسی طرح نوٹوں کے ساتھ مشارکہ یا بیع سلم درست نہیں کیونکہ اس نقطہ نظر کے مطابق نوٹ دَین (Debt) کی رسید ہے جبکہ شرعی اعتبار سے شراکت اور سلم میں سرمایہ نقد ہونا ضروری ہے۔علاوہ ازیں یہ رائے اختیار کر کے ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ سونے کے بدلے سونے کی ادھار اور کمی بیشی کا ساتھ بیع ہوگی جو شرعا درست نہیں۔

مگر یہ موقف درست نہیں کیونکہ اب نوٹ قرض کی رسید نہیں رہا جیسا کہ قبل ازیں بیان ہوا ہے بلکہ اب یہ خود قانونی زر بن چکا ہے اور ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ حکومت کوئی بھی چیز بطور زر اختیار کرسکتی ہے۔اب نوٹ پر لکھی اس عبارت

''حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا''

کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکومت اس کی ظاہری قیمت کی ذمہ دار ہے۔جسٹس علامہ عمر بن عبدالعزیز المترک رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

''نوٹ رسید نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر یہ گم یا تلف ہو جائے تو اس کا مالک جاری کنندہ سے مطالبہ نہیں کرسکتا خواہ اس کے پاس ہزار گواہ ہو اور اگر یہ حقیقی رسید ہوتا تو اس کو ضرور یہ اختیار ہوتا کیونکہ قرض مقروض کے ذمے ہوتا ہے رسید تلف ہونے سے ضائع نہیں ہوتا۔''[1]

2. بعض نامور علماء کے نزدیک نوٹ سامان یعنی جنس (Commodity) کے حکم میں ہیں مشہور مالکی فقیہ علیش مصری کی بھی یہی رائے ہے۔علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

'وممن أفتى بأنها كعروض التجارة العالم المشهور عليش المصرى صاحب النوازل، وشرح مختصر خليل، وتبعه فى فتواه بذلك كثير من متأخرى علماء المالكية'

---

[1] الربا والمعاملات المصرفية فى نظر الشريعة الاسلامية ص 321.

''جن حضرات نے ان کے سامان تجارت ہونے کا فتوی دیا ہے ان میں ''نوازل'' اور ''شرح مختصر خلیل'' کے مصنف مشہور عالم علیش مصری بھی شامل ہیں۔ بعد کے اکثر مالکی علماء نے بھی ان کے فتوی کی پیروی کی ہے۔''[1]

اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نوٹ قیمت بننے کی صلاحیت سے عاری ہے کیونکہ یہ نہ سونا ہے اور نہ چاندی یہ تو سامان کی مانند ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق ایک نوٹ کا دو نوٹوں کے ساتھ تبادلہ درست ہے۔ اسی طرح اس نظریہ کے مطابق نوٹوں میں زکوۃ اسی صورت واجب ہوگی جب ان کو فروخت کر کے نفع کمانا مقصود ہو۔ یعنی نوٹ بذات کو ثمن کی بجائے سامان تجارت قرار پا سکتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر کرنسی نوٹوں سے مضاربہ بھی ناجائز ٹھہرتا ہے کیونکہ مضاربہ میں سرمایہ نقدی کی شکل میں ہونا ضروری ہے جبکہ اس نظریہ کے مطابق کاغذی نوٹ نقدی میں شامل نہیں بلکہ جنس (Commodity) ہے۔ مگر درج ذیل وجوہ کے باعث یہ نقطہ نظر بھی صحیح نہیں ہے۔

- شرعی لحاظ سے نقدی اور سامان میں فرق ہے۔ نقدی محض ذریعہ مبادلہ ہے اسے کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے براہ راست استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس سے صرف اشیاء ضروریات ہی خریدی جا سکتی ہیں اس کے برعکس جنس کو براہ راست بھی استعمال کیا سکتا ہے۔
- سامان میں مختلف اوصاف ملحوظ رکھے جاتے ہیں جبکہ کرنسی میں اوصاف کا خیال نہیں رکھا جاتا ایک سو کے پرانے نوٹ کی بھی وہی مالیت ہوتی ہے جو ایک سو کے نئے نوٹ کی ہوتی ہے۔
- سودی نظام کی بنیاد بھی یہی نظریہ ہے کہ نقدی بھی جنس کی مانند ہے جس طرح سامان کو اصل لاگت سے زائد پر فروخت کیا جا سکتا ہے اسی طرح نقدی کو بھی اس کی اصل قیمت سے زائد پر فروخت کیا جا سکتا ہے یا جس طرح جائیداد کا کرایہ لیا جا سکتا ہے اسی طرح کرنسی کا بھی

[1] اضواء البیان فی تفسیر القرآن بالقرآن ج 1 ، ص 207.

کرایہ لیا جا سکتا ہے۔ چونکہ کرنسی کو جنس قرار دینے سے سود بھی جائز قرار پاتا ہے اس لئے عصر حاضر کے اہل علم اس نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔

3. تیسری رائے یہ ہے کہ نوٹ سونے، چاندی کا متبادل ہیں۔ اگر اس کے پیچھے سونا ہو تو سونے اور اگر چاندی ہو تو چاندی کا متبادل ہوگا۔ جسٹس ڈاکٹر عبداللہ بن سلیمان منیع لکھتے ہیں۔

"اس نظریہ کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ قیمت کے اعتبار سے یہ نوٹ اپنی اس اصل کی طرح ہے جس کے یہ بدل ہیں یعنی سونا اور چاندی کیونکہ ان کا اصل چاندی یا سونا ان کی پشت پر ان کے زر ضمانت کے طور پر موجود ہے اور مقاصد شریعہ کا تعلق تو اصل اور حقائق سے ہے نہ کہ الفاظ اور ان کی بناوٹ سے۔"[1]

اس نقطہ نظر کے مطابق نوٹوں کے باہمی لین دین میں سود کے احکام بھی جاری ہونگے اور جب یہ دوسو درہم چاندی یا بیس دینار سونے کی قیمت کے مساوی ہوں تو سال کے بعد ان پر زکوۃ بھی واجب ہوگی۔ اسی طرح ان کے ذریعے مضاربہ بھی درست ہوگا۔

لیکن یہ رائے بھی کمزور ہے کیونکہ اس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ نوٹ کی پشت پر سونا یا چاندی ہے حالانکہ امر واقع میں ایسا نہیں۔ چنانچہ جسٹس علامہ عبداللہ بن سلیمان منیع اس کی تردید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"یہ نظریہ بھی حقیقت واقعہ کے مطابق نہ ہونے کی بنا پر قابل التفات نہیں کیونکہ اس کا دارومدار کرنسی نوٹوں کی اصل پر ہے اور اصل جیسا کہ ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ وہ تو کرنسی نوٹوں کی پشت پر ہے نہیں۔ بلکہ اکثر ممالک کے نوٹ محض ساکھ کی بنا پر، زبانی ضمانتوں اور حکومتوں کے جاری کردہ ہونے کی بنا پر رائج اور قابل قبول ہیں ورنہ ان کے پیچھے نہ تو سونا ہے نہ چاندی۔ بلکہ کچھ ایسے ہیں جنہیں پراپرٹی کی ضمانت حاصل ہے اور کچھ کو محض اقتدار کی ضمانت۔ لہٰذا یہ نظریہ خلاف واقعہ ہونے کی بناء پر

[1] کاغذی کرنسی کی تاریخ۔ ارتقاء۔ شرعی حیثیت ص:60۔

بہت کمزور ہے۔'' [1]

4. نوٹ کی شرعی حیثیت کے متعلق چوتھی رائے یہ ہے کہ نوٹ دھاتی سکوں (فلوس) کی طرح اصطلاحی زر ہیں جیسا کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے لکھا ہے۔

'الرابع ما هو سلعة بالاصل و ثمن بالاصطلاح كالفلوس...... الى ان قال اذا علمت هذا فالنوط هو من القسم الرابع سلعة باصله لأنه قرطاس و ثمن بالاصطلاح لأنه يعامل به معاملة الاثمان '

''مال کی چوتھی قسم وہ ہے جو اصل میں تو مال ہے لیکن اصطلاحی لحاظ سے زر ہے جیسے دھاتی سکے ہیں...... جب یہ معلوم ہوگیا تو سنو نوٹ کا تعلق چوتھی قسم سے ہے جو حقیقت میں سامان ہے کیونکہ یہ کاغذ ہے اور اصطلاحی طور پر زر ہے کیونکہ اس سے زر جیسا معاملہ کیا جاتا ہے۔'' [2]

لیکن یہ رائے بھی قوی معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اہل علم کے ہاں دھاتی سکوں میں زر کی بجائے سامان کا پہلو غالب ہے یہی وجہ ہے کہ جمہور فقہاء نہ تو کمی بیشی کے ساتھ ان کا تبادلہ مکروہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کو شراکت ومضاربت میں رأس المال بنانے کی اجازت دیتے ہیں۔ نیز ان میں زکوۃ بھی اسی صورت واجب قرار دیتے ہیں جب ان کو فروخت کر کے نفع کمانا مقصود ہو۔ جیسا کہ ''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں ہے:

'الأصح عند الشافعية و الصحيح عند الحنابلة و هو قول الشخين من الحنفية و قول عندالمالكية: أنها ليست أثمانا ربوية و أنها كالعروض '

''امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور مالکی فقہاء کا قول، حنابلہ کا صحیح مسلک اور شافعیوں

---

(1) کاغذی کرنسی کی تاریخ۔ ارتقاء۔ شرعی حیثیت ص:61۔

(2) كفل الفقيه الفاهم فى أحكام قرطاس الدراهم ص 33.

کا صحیح ترین نقطہ نظر یہی ہے کہ دھاتی سکوں میں ربا نہیں ہے بلکہ یہ سامان کی طرح ہیں۔''[1]

'ذهب جمهور الفقهاء ـ ابو حنيفة و ابو يوسف و المالكية على المشهور و الشافعية و الحنابلة الى أن المضاربة لا تصح بالفلوس لأن المضاربة عقد غرر جوز للحاجة فاختص بما يروج غالبا و تسهل التجارة به و هو الاثمان'

''امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، مالکی (مشہور مسلک کے مطابق) شافعی اور حنبلی فقہاء کا خیال ہے کہ دھاتی سکوں کے ذریعے مضاربہ درست نہیں کیونکہ مضاربہ عقد غرر ہے جو ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے چنانچہ یہ انہی چیزوں کے ساتھ خاص رہے گا جو اکثر مروج ہوں اور ان کے ساتھ تجارت آسان ہو۔ اور وہ نقدیاں ہیں۔''[2]

یعنی دھاتی سکے زر نہیں۔

'فذهب الشافعية و الحنابلةالى أن الفلوس كالعروض فلا تجب الزكاة فيهاالا اذا عرضت للتجارة'

''شافعی اور حنبلی فقہاء کی رائے میں دھاتی سکے سامان کی طرح ہیں چنانچہ ان میں زکوۃ اسی وقت واجب ہوگی جب یہ تجارت کی غرض سے ہوں۔''[3]

ان فقہاء کے نقطہ نظر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کسی حدیث میں دھاتی سکوں کی زکوۃ کا تذکرہ نہیں ملتا حالانکہ عہد نبوی میں یہ موجود تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اگر یہ زر ہوتے تو سونے چاندی کی طرح ان کی زکوۃ کا بھی ذکر ہوتا۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کی اس

---

① 32/205 : مادة فلوس

② الموسوعة الفقهية الكويتية : مادة مضاربة

③ ايضاً 32/205۔

روایت کہ انہوں نے اپنی لونڈی سے کہا:

"اس کے فلوس خرید لو۔"

سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ صحابہ کے ہاں دھاتی سکے سامان شمار ہوتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہاء احناف کے نزدیک دھاتی سکے زر ہیں اسی لئے وہ ان میں زکوۃ بھی واجب قرار دیتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ کے نزدیک متعاقدین دھاتی سکوں کو متعین کر کے ان کی زری حیثیت ختم کر سکتے ہیں اس صورت میں یہ سامان کے حکم میں ہوتے ہیں اوران حضرات کے نزدیک کمی بیشی کے ساتھ ان کا تبادلہ بھی صحیح ہوتا ہے۔

ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ فقہاء کی نظر میں دھاتی سکے (فلوس) یا تو زر ہی نہیں یا پھر ناقص زر ہیں اسی لئے وہ ان سے زر کا وصف ختم کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ جو صورت بھی ہو بہر حال کرنسی نوٹوں کو ان پر قیاس نہیں کیا سکتا کیونکہ نہ تو دھاتی سکوں کی طرح ان میں سامان کا پہلو غالب ہے یہ تو محض کاغذ کے ٹکڑے ہیں ان کی جو حیثیت بھی ہے وہ ان کی پشت پر حکومتی ضمانت کی وجہ سے ہی ہے اور نہ ہی متعاقدین کو ان کی زری حیثیت کالعدم کرنے کا اختیار ہے کیونکہ یہ قانونی زر ہیں۔

5. اس سلسلہ میں پانچویں اور آخری رائے یہ ہے کہ نوٹ سونے چاندی کی طرح مستقل زر ہے کیونکہ نوٹوں میں زر کی تمام صفات پائی جاتیں ہیں۔ قیمتوں کا پیمانہ اور قابل ذخیرہ بھی ہیں اور لوگ ان پر اعتماد بھی کرتے ہیں شرعی اعتبار سے یہی زر کی حقیقت ہے جیسا کہ ہم شروع میں امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کر آئے ہیں۔

"اگر لوگ اپنے درمیان چمڑوں کے ذریعے خرید وفروخت کو رائج کر دیں یہاں تک کہ وہ چمڑے ثمن اور سکہ کی حیثیت اختیار کر جائے تو میں سونے چاندی کے بدلے ان چمڑوں کو ادھار فروخت کرنا پسند نہیں کروں گا۔"

اس کا مطلب ہے کہ کسی بھی چیز کو خواہ وہ چمڑا ہی کیوں نہ ہو بطور زر اختیار کیا جا سکتا ہے اس

کی تائید شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔

أما الدرهم والدينار فما يعرف له حد طبعي ولا شرعي بل مرجعه الى العادة والاصطلاح وذلك لأنه في الأصل لا يتعلق المقصود به بل الغرض أن يكون معيارا لما يتعاملون به والدراهم والدنانير لا تقصد لنفسها بل هي وسيلة الى التعامل بها ولهذا كانت أثمانا بخلاف سائر الأموال فان المقصود الانتفاع بها نفسها فلهذا كانت مقدرة بالأمور الطبعية أو الشرعية والوسيلة المحضة التي لا يتعلقبها غرض لا بمادتها ولا بصورتها يحصل بها المقصود كيف ما كانت'

''اس کا خلاصہ یہ ہے کہ درہم و دینار کی کوئی ذاتی اور شرعی تعریف نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق عرف اور اصطلاح سے ہے کیونکہ درہم و دینار بذات خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ یہ باہمی لین دین کا ذریعہ ہیں اسی لئے یہ قیمت شمار ہوتے ہیں چونکہ باقی اموال سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے اس لئے ان کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ وہ ذریعہ جس کے مادہ اور صورت سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو وہ جیسا بھی اس سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔''[1]

چونکہ دلائل کے لحاظ سے یہ نقطہ نظر قوی ہے اور اس پر کئے گئے اعتراضات بھی زیادہ وزنی نہیں اس لئے دور حاضر کے علماء کی اکثریت 'بیشتر مفتیان کرام کے فتاوی اور اہم فقہی اداروں کی قراردادیں اسی کے حق میں ہیں۔

جسٹس علامہ عبداللہ بن سلیمان منیع کی بھی یہی رائے ہے۔[2]

سعودی کبار علماء کی مجلس نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔[3]

---

① مجموع الفتاوى ج 19، ص251_252.

② کاغذی کرنسی کی تاریخ۔ارتقاء۔شرعی حیثیت ص:90۔

③ المجلة البحوث الاسلامية ع 1، ص221.

جسٹس علامہ عمر بن عبدالعزیز المترک رحمہ اللہ بھی اسی قول کے حق میں ہیں۔ چنانچہ وہ مذکورہ بالا آراء اور ان کے دلائل کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

''کاغذی زر کے متعلق علماء کی آراء اور ہر ایک کے نقطہ نظر کا تنقیدی جائزہ لینے سے ہمیں ان کا قول راجح معلوم ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نوٹ مستقل کرنسی ہے اور سونے چاندی کی طرح ان میں بھی سود کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ ربا، سود اور تلف کی صورت میں ضمان کے مسائل میں ان پر مکمل طور پر سونے چاندی کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔''[1]

دوسرے اقوال کی خرابیاں واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دوسرے اقوال یا تو معاملات میں لوگوں کو مشکل میں ڈال دینگے یا لین دین کا دروازہ ہی بند کر دینگے حالانکہ اس کے بغیر چارہ نہیں یا پھر سود کا دروازہ چوپٹ کھول دینگے اور نقدین کی زکوۃ ضائع کرنے کے حیلوں کا دروازہ کھولے گے۔''[2]

کاغذی کرنسی کا نصاب زکوۃ

کاغذی نوٹ کو مستقل کرنسی قرار دینے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس پر زکوۃ کس حیثیت سے عائد ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب نوٹ سونے یا چاندی میں سے جس کے نصاب کی مالیت کم ہو کے برابر پہنچ جائیں تو ان پر زکوۃ واجب ہوگی کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر زکوۃ واجب ہوگی جس سے فقراء و مساکین کو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ سونے کا نصاب ساڑھے سات اور چاندی کا ساڑھے باون تولے ہے چونکہ سونے کے مقابلہ میں چاندی کے نصاب کی مالیت

---

① الربا والمعاملات المصرفیۃ فی نظر الشریعۃ الاسلامیۃ ص 339.

② حوالہ مذکورہ۔

خاصی کم ہے اس لئے کرنسی نوٹوں کی زکوۃ کیلئے چاندی کو معیار بنایا جائے گا،لہذا جب نوٹ ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے مساوی ہوں تو ان پر زکوۃ واجب ہوگی۔

علاوہ ازیں احتیاط اور تقوی کا تقاضا بھی یہ ہے کہ چاندی کو معیار بنایا جائے تا کہ کہیں اللہ کا حق ہمارے ذمے نہ رہ جائے ، کیونکہ زکوۃ اہم ترین دینی فریضہ ہے جس کی ادائیگی ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہونی چاہیے۔فرمان نبوی ﷺ ہے:

'دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ'

''جو چیز تجھے شک میں ڈالے اس کو چھوڑ دے جو شک میں نہ ڈالے اس کو قبول کرلے۔''[1]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ تو پھر سونے ،چاندی کی طرف ہی رجوع ہوا گویا سونا چاندی اصل ہیں اور کرنسی ان کی نمائندہ ۔لیکن راقم الحروف کے خیال میں یہ مسئلہ کی غلط توجیہ ہے مشابہت کی بنا پر وجوب زکوۃ اور وقوع ربا میں سونے ،چاندی کو معیار بنانے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ کاغذی کرنسی سونے چاندی کی نمائندہ ہے۔

مختلف کرنسیوں کا باہمی تبادلہ

جب کاغذی کرنسی بحیثیت زر سونے ،چاندی کے سکوں دینار ودرہم کے حکم میں ہے تو جس طرح دینار ودرہم کا ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ صحیح ہے اسی طرح دو مختلف کرنسیوں کا بھی باہم تبادلہ درست ہے۔

شریعت نے دینار کے عوض دینار اور درہم کے بدلے درہم کے تبادلہ میں برابری اور دونوں طرف سے مجلس عقد میں ادائیگی کی لازمی شرط لگائی ہے لیکن جب دینار اور درہم کا باہم تبادلہ ہو تو پھر صرف دونوں جانب سے موقع پر ادائیگی ضروری قرار دی ہے تفاوت کو جائز رکھا ہے جیسا کہ

---

[1] سنن الترمذی: ابواب الزھد عن رسول اللہ ﷺ، رقم الحدیث 2708.

ذیل کی حدیث میں ہے۔

'الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هَذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ'

''سونا سونے کے بدلے۔ چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جو جو کے بدلے، کھجور کھجور کے بدلے اور نمک نمک کے عوض مقدار میں مساوی ایک جیسے اور نقد بہ نقد ہونے چاہیے۔ جب یہ قسمیں تبدیل ہو جائیں تو پھر جیسے چاہو بیچو بشرطیکہ دونوں طرف سے نقد ہو۔''[1]

اس حدیث مبارک سے واضح طور پر یہ ثابت ہو رہا ہے کہ دینار اور درہم کا آپس میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ درست ہے کیونکہ یہ اپنی ذاتی قیمت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ کے حوالے سے پیچھے بیان ہو چکا ہے۔ جس طرح دینار اور درہم اپنی ذاتی قیمت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کا آپس میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے اسی طرح ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک کی کرنسی سے مختلف ہے کیونکہ کرنسی ،قوت خرید کے ایک مخصوص معیار کا نام ہے اور ہر ملک کی کرنسی اس ملک کے اقتصادی حالات کی وجہ سے اپنی ایک خاص قیمت رکھتی ہے۔ لہذا ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ دونوں جانب سے ادائیگی نقد ہو، جیسا کہ ''المجمع الفقهی الاسلامی'' مکہ مکرمہ کی ایک قرارداد میں کہا گیا ہے:

''مختلف ممالک کی کاغذی کرنسیاں، محل اجراء کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف اجناس شمار ہوں گئیں۔ یعنی سعودی کرنسی ایک جنس ہے اور امریکی کرنسی الگ جنس ہے ان کی

---

[1] صحیح مسلم باب الصرف و بیع الذهب

آپس میں خرید وفروخت مطلق درست ہوگی بشرطیکہ دونوں طرف سے نقد ونقد ہو۔''[1]

اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ جب معاملہ نقد ونقد ہوگا تو لامحالہ بازار کے نرخ پر ہی ہوگا، مثلاً ایک شخص روپے دے کر ڈالر لینا چاہتا ہے تو ظاہر ہے وہ ڈالر کے بدلے اتنے روپے ہی دے گا جتنے اسے بازار کے لحاظ سے دینے چاہیے لیکن ادھار کی صورت میں کمی بیشی سے اس کے اندر سودی آلائش شامل ہو جائے گی۔ وہ اس طرح کہ جو شخص آج پچاسی روپے دے کے یہ طے کرتا ہے کہ وہ ایک مہینہ بعد ایک ڈالر لے گا تو اس کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ایک مہینہ بعد ڈالر اور روپے کے درمیان یہی نسبت ہوگی۔ لہذا اس نے روپے اور ڈالر کے درمیان جو پیشگی ایک نسبت متعین کر لی ہے یہ سودی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے اس لئے یہ ناجائز ہے۔

علاوہ ازیں ادھار میں یہ قباحت بھی مضمر ہے کہ اس سے سودی عناصر کو اپنا مذموم دھندہ جاری رکھنے کے لئے سازگار ماحول میسر آ سکتا ہے۔ وہ یوں مثلاً کسی شخص کو اسّی روپے دیکر سو وصول کرنا سود ہے اب ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اسّی دیکر چھ ماہ بعد سو وصول کرے تو وہ یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ ضرورت مند کو اسّی روپے دینے کی بجائے چھ مہینے کے لیے ایک ڈالر سو روپے میں بیچ دے۔ یوں ادھار کی اجازت کو سود حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لے۔ الہٰذا دو مختلف کرنسیوں کے تبادلے میں کسی جانب سے ادھار کی اجازت نہیں ہے۔ چونکہ دونوں جانب سے نقد ہونے کی صورت میں یہ خطرہ نہیں ہے اس لیے نقد ایک ڈالر جتنے کا چاہیں بیچیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جسٹس علامہ عمر بن عبدالعزیز المترک رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

''نام، صفات اور جاری کنندہ کے اعتبار سے ان کی مختلف اجناس ہیں۔ سعودی ریال ایک جنس ہے، مصری پونڈ الگ جنس ہے، عراقی دینار مختلف جنس ہے، شامی لیرا، لبنانی لیرا، امریکی ڈالر اور آسٹریلوی ڈالر الگ الگ اجناس ہیں۔ جیسے گندم اور جو اگرچہ دونوں دانوں کی جنس سے تعلق رکھتے ہیں مگر ایک دوسرے سے علیحدہ جنس شمار ہوتے

[1] مجمع الفقه الاسلامى ، قرارات المجلس ص :97.

ہیں۔ایسے ہی گندم اور جو کا آٹا ہے اگر چہ دونوں پر آٹے کا اطلاق ہوتا ہے لیکن یہ مختلف اجناس ہیں۔اس بنا پر ایک جنس کی اپنی ہی جنس سے ادھار اور کمی بیشی کے ساتھ بیع درست نہیں۔البتہ دوسری جنس کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ہوسکتا ہے مگر ادھار یہاں بھی درست نہیں۔اسی طرح ان کی سونے چاندی کے ساتھ نقد بیع درست ہے مگر ادھار صحیح نہیں۔یہی قول صحیح ہے''ان شاءاللہ'' کیونکہ یہ مقاصد شریعت اور اس مصلحت کے موافق ہے جس کی وجہ سے سونے چاندی میں ربا حرام قرار دیا گیا ہے۔''[1]

جس طرح دو مختلف کرنسیوں کا باہم اختلاف کے ساتھ لین دین درست ہے اسی طرح ایک کرنسی میں واجب شدہ مالی حق کی ادائیگی بھی دوسری کرنسی میں ہوسکتی ہے۔مثلاً ایک شخص نے پاکستانی روپے میں کوئی معاملہ طے کیا ہے لیکن بوقت ادا وہ کسی وجہ سے پاکستانی روپے کی بجائے سعودی ریال یا امریکی ڈالر میں ادائیگی کرنا چاہے تو شرعا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے تاہم اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں کرنسیوں کے تبادلے کی اس شرح کو بنیاد بنایا جائے جو ادائیگی کے دن ہو اور مقروض وہ ریال یا ڈالر اسی مجلس میں صاحب حق کے سپرد کردے۔چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

''كُنتُ أَبِيعُ الإِبِلَ بِالْبَقِيعِ فَأَبِيعُ بِالدَّنَانِيرِ وَآخُذُ الدَّرَاهِمَ وَأَبِيعُ بِالدَّرَاهِمِ وَآخُذُ الدَّنَانِيرَ آخُذُ هَذِهِ مِنْ هَذِهِ وَأُعْطِي هَذِهِ مِنْ هَذِهِ فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ فِي بَيْتِ حَفْصَةَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ رُوَيْدَكَ أَسْأَلُكَ إِنِّي أَبِيعُ الإِبِلَ بِالْبَقِيعِ فَأَبِيعُ بِالدَّنَانِيرِ وَآخُذُ الدَّرَاهِمَ وَأَبِيعُ بِالدَّرَاهِمِ وَآخُذُ الدَّنَانِيرَ آخُذُ هَذِهِ مِنْ هَذِهِ وَأُعْطِي هَذِهِ مِنْ هَذِهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا بَأْسَ أَنْ تَأْخُذَهَا بِسَعْرِ يَوْمِهَا مَا

[1] الربا والمعاملات المصرفیۃ فی نظر الشریعۃ الاسلامیۃ ص 339.

لَم تَفتَرِقَا وَبَینَکُمَا شَیءٌ"

"میں بقیع جگہ پر اونٹ فروخت کرتا تھا تو کبھی دیناروں میں فروخت کرتا اور درہم وصول کرتا اور کبھی دراہم میں بیچتا لیکن دینار وصول پاتا یعنی دنانیر کی بجائے دراہم اور دراہم کی بجائے دنانیر لیتا تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر تھے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ذرا ٹھریئے میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں بقیع میں اونٹ بیچتا ہوں دینار کے ساتھ بیچ کر درہم اور درہم کے ساتھ بیچ کر دینار سے وصولی پاتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اسی دن کے ریٹ کے مطابق ہو اور تمھارے درمیان اس طرح جدائی نہ ہو کہ کوئی لین دین باقی ہو۔"[1]

کرنسی میں بیع سلم

معاصر معیشت میں بل آف ایکسچینج کا ڈسکاؤنٹ سود پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ بعض اسلامی بینکوں نے اس کا حل یہ ڈھونڈا ہے کہ بینک ڈسکاؤنٹ کی بجائے بیع سلم کی بنیاد پر معاملہ کر لے۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بینک ہنڈی میں درج ڈالر کی مالیت کے برابر رقم حامل ہنڈی (Drawer) کو ڈالر کی پیشگی قیمت کے طور پر ادا کر دیتا ہے اور یہ طے پا جاتا ہے کہ اس نے اتنی مدت بعد اتنے ڈالر بینک کے حوالے کرنے ہیں۔ جب ہنڈی میچور ہو جاتی ہے اور حامل ہنڈی اس شخص جس کے نام ہنڈی ہو (Drawee) سے ڈالر وصول پا لیتا ہے تو وہ بینک کے حوالے کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے بینک اپنا کمیشن منہا کر کے ہی اس کو رقم ادا کرے گا اور جب وصولی کے بعد ڈالر آگے فروخت کرے گا تو پھر کمیشن وصول کرے گا، اور یہی کمیشن بینک کا منافع ہوتا ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد باب فی اقتضاء الذهب من الورق .

چونکہ دو مختلف ممالک کی کرنسیوں کے تبادلے میں دونوں طرف سے موقع پر ادائیگی لازمی شرط ہے جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے اور اس صورت میں ڈالر کی سپردگی مؤخر ہوتی ہے اس لئے یہ جائز نہیں۔ خود موجودہ اسلامی بینکاری کے شریعہ سکالرز بھی یہ کہتے ہیں کہ دو مختلف کرنسیوں کے تبادلہ میں دونوں طرف سے موقع پر قبضہ ضروری ہے۔ چنانچہ مروجہ اسلامی بینکوں کی رہنما دستاویز ''المعاییر الشرعیہ'' میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے:

'و بناء علیه اشترط في تبادل العملات من الجنس نفسه التماثل بين البدلين و التقابض للبدلين قبل تفرق العاقدين مع اختلاف الجنس فلا بأس من التفاوت و لكن لا بد من التقابض في المجلس'

''اسی بنا پر ایک جنس کی کرنسی کے تبادلہ میں یہ شرط ہے کہ دونوں جانب سے برابر برابر ہو اور فریقین کے الگ ہونے سے قبل قبضہ ہو جائے۔ لیکن اگر جنس مختلف ہو تو پھر کمی بیشی میں تو کوئی حرج نہیں البتہ دونوں طرف سے مجلس میں قبضہ ضروری ہے۔''[1]

ملکی کرنسی کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ

چونکہ ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹ یکساں اوصاف کے حامل ہونے کی وجہ سے ایک ہی جنس شمار ہوتے ہیں اس لئے ان کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ کسی صورت جائز نہیں ہے۔ لہٰذا عید کے موقع پر نئے نوٹوں کی خرید وفروخت جس میں نئے نوٹ دینے والا کم نوٹ دے کر اپنا معاوضہ رکھتا ہے شرعاً سودی لین دین ہے۔ اسی طرح سو روپے کا نوٹ دے کر پچانوے سکے یا روپے لینا بھی سود میں داخل ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی چونکہ نوٹوں کو دھاتی سکوں پر قیاس کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک متعاقدین دھاتی سکوں سے زر کا وصف ختم کر کے بحیثیت جنس

---

[1] المعايير الشرعية ص: 10.

ایک سکے کے ساتھ دوسکوں کا تبادلہ کر سکتے ہیں جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ہے اس لئے مولانا احمد رضا خاں بریلوی دس روپے کے نوٹ کو بارہ روپے میں بیچنا جائز سمجھتے ہیں۔دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ نوٹ اصطلاحی زر ہے اوراس معاملہ میں کسی دوسرے کو متعاقدین پر کوئی اختیار نہیں وہ دونوں جو کمی بیشی کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔چنانچہ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں۔

'یجوز بیعه بأزید من رقمه و بأنقص منه کیفما تراضیالما علمت أن تقدیر ها بهذه المقادیر انما حدث باصطلاح الناس و هما لا ولایة للغیر علیهما کما تقدم عن الهدایة و الفتح فلهما أن یقدرا بما شاء ا من نقص و زیادة'

"نوٹ کواس کی مالیت سے کم یا زائد جس قیمت پر بھی وہ متفق ہو جائیں بیچنا جائز ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ان کی یہ قیمت لوگوں کی اصطلاح کی بنا پر ہے۔لہذا ان دونوں کو یہ اختیار ہے کہ جو کمی بیشی چاہیں کریں۔"[1]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دھاتی سکوں کے متعلق امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کا یہی مسلک ہے لیکن اس کو کرنسی نوٹوں پر منطبق کرنا کسی صورت درست نہیں۔اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

- کرنسی نوٹ قانونی زر ہیں۔حکومت کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کی قانونی حیثیت کالعدم قرار دے سکے۔
- دھاتی سکے ایسی دھات کے ہوتے ہیں جس کی کچھ نہ کچھ اپنی ذاتی افادیت بھی ہوتی ہے جبکہ نوٹوں کا لین دین زر سمجھ کر ہی کیا جاتا ہے اگران کے اندر سے یہ وصف نکال دیا جائے تو ان کی حیثیت ردی کاغذ کے برابر رہ جاتی ہے جس سے کسی کو خاص دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

---

(1) کفل الفقیه فی أحکام قرطاس الدراهم ص 55.

✿ یہ فتوی سودی کاروبار کیلئے بطور ڈھال استعمال ہوسکتا ہے وہ یوں کہ قرض دہندہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اس کو قرض نہیں دیا بلکہ اپنے نوٹ ادھار زائد قیمت پر فرخت کئے ہیں اس طرح وہ جتنا سود چاہے لے سکتا ہے۔

بریلوی علماء بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اس طرح سود کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا چنانچہ مشہور بریلوی عالم مولانا غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں۔

"اگر قرض دینے والا اپنے قرض کے بدلے سود لینا چاہے گا تو وہ اس طرح بآسانی لے سکے گا کہ قرض دار کو اپنے کرنسی نوٹ زیادہ قیمت پر فروخت کرے گا اس طرح وہ اپنے قرض کے بدلے سود حاصل کرے گا۔"[1]

مندرجہ بالا بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ کرنسی نوٹوں کے زر ہونے میں اب کوئی اشکال نہیں رہا اس لئے اہل علم سود اور زکوۃ کے معاملہ میں بلاتردد ان پر سونے، چاندی کے احکام منطبق کرتے ہیں۔

قرضوں کی اشاریہ بندی (انڈیکسیشن)

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ کاغذی کرنسی کی تیزی کے ساتھ گرتی ہوئی قیمت کے ہماری معیشت پر ناخوشگوار اثرات مرتب ہورہے ہیں اور لوگوں کے معاشی مسائل بڑھ رہے ہیں' بالخصوص کم آمدنی والا طبقہ بہت بری طرح متأثر ہورہا ہے۔اصحاب ثروت میں قرض حسنہ دینے کا جذبہ ماند پڑ رہا ہے۔لوگ کسی فاقہ مست کو قرض دینے کی بجائے سونا یا زمین خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں جو رقم ہم آج بطور قرض دینگے چھ مہینے بعد اس سے وہ چیز حاصل نہیں ہوسکے گی جو آج ہوسکتی ہے لہذا قرض دینے کی بجائے بہتر ہے اس سرمایہ سے سونا یا کوئی جائیداد خرید لی جائے۔یوں اسلامی اقدار پامال ہورہی ہیں۔

---

[1] شرح صحیح مسلم ج 4 ، ص366.

اس کا اصل حل تو یہی ہے کہ حکومت افراط زر کے عوامل دور کر کے کرنسی کی قدر میں استحکام پیدا کرے لیکن بعض حلقوں کی جانب سے یہ تجویز بھی پیش کی جاتی ہے کہ امدادی قدم کے طور پر قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کر دیا جائے تا کہ اس کے مضر اثرات پر قابو پایا جا سکے اور قرض دہندگان کے سرمایہ کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ ہو سکے۔ یوں قرض دہی کا جذبہ بھی پروان چڑھتا رہے گا۔

اشاریہ کی مختصر اور عام فہم تعریف یوں ہے۔

''ایسا نمبر جس سے یہ علم ہو کہ گردش ایام سے قیمتوں، تنخواہوں یا کسی دوسرے معاشی پیمانے میں کتنا تغیر واقع ہوا ہے اشاریہ کہلاتا ہے۔''

اشاریہ بندی کیلئے'' صارف کی اشیاء کی ٹوکری''(Basket Of Consumers Goods) جس میں روزمرہ کے استعمال کی اہم اشیاء اور اجرتیں شامل ہوتیں ہیں کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مالی سال کے شروع اور آخر میں اس ٹوکری میں شامل اشیاء و خدمات کی قیمتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے' پھر جس تناسب سے ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہوتا ہے اسی تناسب سے کرنسی کی قوت خرید میں کمی تصور کیجاتی ہے۔ اس کا مقصد مؤجل ادائیگیوں کو مستحکم کرنا ہوتا ہے تا کہ حق دار نقصان نہ اٹھائیں۔

اشاریہ بندی کے اس طریقہ کار کے مطابق قرضوں کی اشاریہ بندی کا مطلب ہو گا کہ مقروض قرض کی ادائیگی کے وقت اشیاء وخدمات کی قیمتوں میں اضافے کے تناسب سے زائد رقم ادا کرے۔ ان حضرات کے نزدیک یہ اس مسئلے کا بہترین حل ہے اس کے بغیر نہ تو معاملات میں عدل کے تقاضے پورے کئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی استحصال کا خاتمہ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس کا تحقیقی اور تجزیاتی جائزہ لیا جائے تو اس میں درج ذیل قباحتیں نظر آتیں ہیں۔

1. اس میں ربا کا پہلو پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں دی گئی رقم کے عوض زائد واپس کرنے کی شرط ہوتی ہے' شرعی لحاظ سے قرض میں اس قسم کی شرط سود کے زمرہ میں آتی ہے۔

اشاریہ بندی کے حامی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ شریعت نے قرض کی واپسی کے حوالے جس برابری کا تقاضا کیا ہے اس سے ظاہری برابری مقصود نہیں بلکہ قیمت و مالیت اور صفت و منفعت کے لحاظ سے برابری مراد ہے۔لہٰذا قرض دار جو زائد روپے واپس کر رہا ہے وہ اضافہ نہیں ہے بلکہ اصل میں وہی مالیت ادا کر رہا ہے جو اس نے لی تھی۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ جواب درست نہیں اس لئے کہ شرعا زر کے لین دین اور جنس کے لین دین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔اگر کسی شخص نے چالیس کلوگرام گندم ادھار لی ہے تو وہ اتنی مقدار ہی واپس کرے گا خواہ اس عرصہ میں اس کی قیمت میں کتنا فرق آچکا ہو۔اسی طرح اگر زر کی کوئی خاص مقدار قرض لی گئی ہو تو وہی مقدار واپس کی جائے گی خواہ اس عرصہ میں اشیاء و خدمات کے مقابلہ میں اس کی قدر میں کتنی تبدیلی واقع ہو چکی ہو یعنی قرض کی واپسی میں مقدار کا اعتبار ہے نہ کہ مالیت اور قیمت کا۔یہی وجہ ہے تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اضافے کی شرط سے عقد قرض فاسد ہو جاتا ہے خواہ اضافہ مقدار میں ہو کہ مقروض لئے گے مال سے زائد واپس کرے، یا کسی دوسرے مال سے ہدیہ کی صورت میں ہو، یا کوالٹی میں کہ قرض گیر قرض لی گئی چیز سے عمدہ واپس کرے۔اس قسم کا ہر اضافہ سود شمار ہوتا ہے۔[1]

اس کے ربا ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ عہد نبوی میں قرض کا لین دین بھی ہوتا تھا اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ بھی، مگر ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ فلاں قرض دہندہ نے اضافی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔

2. مقروض نے ایک ہزار کے بدلے کتنے روپے اضافی واپس کرنے ہیں اشاریہ بندی میں اس کا تعین نہیں ہوتا۔یہ غرر (Uncertainty) ہے جو مالی معاہدوں میں ناجائز ہے۔

اشاریہ بندی کے قائلین کا موقف ہے کہ غرر تو اشاریہ بندی نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں فریقین کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ بوقت ادائیگی کاغذی نوٹ کی قوت خرید کیا ہوگی۔

---

[1] الموسوعة الفقهية الكويتية ج 33، ص 130.

اس جواب یہ ہے کہ قرض کی واپسی میں شرعاً عددی برابری قابل لحاظ ہے نہ کہ قیمت و مالیت کا۔ مقدار میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ اس کے برعکس اشاریہ بندی میں یہ قطعاً طے نہیں ہوتا ہے کہ بوقت ادائیگی قیمت و مالیت کیا ہوگی۔

3. اس میں ناانصافی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے وہ اس طرح کہ ماہرین معیشت کے نزدیک کرنسی کی قدر میں کمی کے پیچھے متعدد عوامل کا مجموعی عمل کارفرما ہوتا ہے۔ ماہرین کے نزدیک ان عوامل میں قرض دینا شامل نہیں، اب قرض گیر کو ایک ایسے عمل کا ذمہ دار ٹھہرانا جس کا وہ سبب نہیں بنا کہاں کا انصاف ہے؟۔

اشاریہ بندی کے قائلین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جب کسی کے ذمہ کوئی ادائیگی ہو اور اس دوران حکومت کرنسی کو منسوخ کردے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ، حنبلی فقہاء کے راجح اور مالکیہ کے غیر مشہور مسلک کے مطابق مقروض کی طرف سے اسی کرنسی میں ادائیگی درست نہیں بلکہ اس قیمت کی ادائیگی واجب ہوگی جو تنسیخ زر کی تاریخ پر اس کرنسی میں بنتی تھی جس کی اساس پر معاہدہ ہوا تھا۔[1]

حالانکہ کرنسی کی تنسیخ میں مقروض کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ لیکن ان فقہاء نے محض اس لئے کہ جب یہ نقص واقع ہوا تھا تو وہ مقروض کے قبضہ میں تھی اس کو ذمہ دار ٹھرایا ہے۔ اسی طرح اگرچہ مقروض کرنسی کی قدر میں کمی کا سبب نہیں مگر اس کا ازالہ اس کی ذمہ داری ہے کیونکہ جب کمی واقع ہوتی ہے تو وہ اس کے قبضہ میں ہوتی ہے۔

لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس استدلال کی کمزوری بالکل واضح ہے کیونکہ ان فقہاء نے اس صورت میں قیمت کا اعتبار اس بنا پر کیا ہے کہ معاہدے کے دن رائج کرنسی منسوخ ہونے کی وجہ سے مثل سے ادائیگی ممکن نہیں رہی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کسی طور پر درست نہیں کہ کرنسی کی قدر میں کمی کا ازالہ مقروض کی ذمہ داری ہے۔

اشاریہ بندی میں ناانصافی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان عموماً پس انداز رقم ہی بطور قرض

---

[1] الموسوعة الفقهية الكويتية ج21، ص66 مادة دين.

دیتا ہے اور ہر بچت کار کی غرض بھی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے' کوئی پلاٹ خریدنے کیلئے بچت کرتا ہے، کوئی سونا خریدنا چاہتا ہے اور کوئی مکان تعمیر کرنا۔ شاذونادر ہی کوئی ایسا بچت کار ہوگا جس کے پیش نظر اشیاء کی ٹوکری ہو۔ سب بچت کاروں کیلئے اشیاء کی ٹوکری کو اساس بنانا مضحکہ خیز ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ صرف قیمتیں بڑھنے کی صورت میں اشاریہ بندی کی جاتی ہے کمی کی صورت میں نہیں کی جاتی ۔ کیونکہ اس پر کوئی عمل کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ اگر اشاریہ بندی عدل کا تقاضا ہے تو اسے تفریط زر کی صورت میں بھی اختیار کیا جائے۔

4. اشاریہ سے قیمتوں کا تعین صرف ایک اندازہ اور تخمینہ ہوتا ہے جبکہ قرض کی واپسی کو اندازے اور تخمینے سے مشروط کرنا جائز نہیں۔

5. ہمارے دین میں بلاسود قرض دینا ایک نیکی ہے جس کا آخرت میں قرض دہندہ کو اجر ملے گا اور اگر روپے کی قدر میں کمی کا ازالہ مقروض کی ذمہ داری ہو تو قرض نیکی نہیں رہے گا۔

یہی وہ خرابیاں ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ شرعی اعتبار سے قرضوں کی اشاریہ بندی کی سکیم قابل عمل نہیں۔ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اسے خلاف شرع قرار دیا ہے۔ دیکھیے: ''رپورٹ بلاسود بنکاری'' ص 22۔

اس کے علاوہ اگر معاشی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اشاریہ بندی کی سکیم بے فائدہ ہے کیونکہ یہ طے شدہ ہے کہ تمام شعبوں میں نفع پذیری کی شرح یکساں نہیں ہوتی۔ جن شعبوں میں تو منافع کی شرح عمومی سطح کی قیمتوں کے اضافے کے برابر یا زائد ہوگی وہ فائدے میں رہیں گے لیکن وہ شعبے جہاں قیمتوں میں اضافہ کے تناسب سے نفع حاصل نہیں ہوتا خسارے میں رہیں گے جیسے صنعتی شعبہ ہے یہاں بعض حالات میں عمومی سطح کے افراط زر کی شرح کے تناسب سے نفع نہیں ہوتا۔ اسی طرح زراعت کا شعبہ بھی متاثر ہوسکتا ہے کیونکہ زرعی اجناس کی قیمتیں بالعموم حکومت خود طے کرتی ہے یا پھر بین الاقوامی طلب ورسد کی بنیاد پر طے ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر افراط زر کی شرح منافع کی شرح سے زائد ہوگی تو اشاریہ بندی کی وجہ سے شراکت کی بنیاد پر سرمایہ

کاری کی بھی حوصلہ شکنی ہو گی۔

بلکہ بعض ماہرین معیشت کے نزدیک اشاریہ بندی ایک طرح سے خود اپنے جلو میں افراط زر لے کر آتی ہے اور اس سے افراط زر کا ایک خود کار نظام جنم لیتا ہے یہی وجہ ہے جن ممالک نے یہ سکیم اختیار کی وہاں افراط زر کی شرح میں اضافہ تو ہوا ہے کمی واقع نہیں ہوئی۔

اسی طرح نظری لحاظ سے بھی اشاریہ بندی کی سکیم غلط ہے کیونکہ اشیاء و خدمات کی قیمتوں کا تعین زر کرتا ہے لیکن اشاریہ بندی میں دونوں ایک دوسرے کی قیمتوں کا تعین کرتے ہیں یعنی زر کی قیمت کا تعین اشیاء و خدمات اور اشیاء خدمات کی قیمتوں کا تعین زر کرتا ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول سے غلط استدلال

اشاریہ بندی کے قائلین کی رائے میں دھاتی سکوں (فلوس) کے بارہ میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا نقطہ نظر اشاریہ بندی سے ملتا جلتا ہے۔

اس کی توضیح یوں ہے کہ جب دھاتی سکوں کے ذریعے کوئی چیز ادھار خریدی جائے یا کسی کو یہ سکے قرض دیئے جائیں اور پھر ادائیگی سے قبل سکوں کی قیمت کم ہو جائے تو جمہور فقہاء جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں کے نزدیک جتنے سکے بطور قیمت بائع کے ذمے واجب ہوئے تھے یا جتنے سکے قرض گیرنے لئے تھے اتنے ہی واپس کرنا ہوں گے۔ سکوں کی قوت خرید کمی بیشی کی وجہ سے ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہو گی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سکے اموال مثلیہ میں شامل ہیں یعنی ان کی اکائیوں میں فرق نہیں ہے اور اموال مثلیہ میں مقدار کا خیال رکھا جاتا ہے نہ کہ قیمت و مالیت کا۔

اس کے برعکس امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ادائیگی سکوں کی قیمت میں کمی بیشی ملحوظ رکھ کر کی جائے گی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ مذکورہ سکے دراصل دراہم کی ریز گاری ہے دس سکے ایک درہم کے مساوی ہیں یعنی ایک سکہ درہم کا دسواں حصہ ہے تو دس سکے قرض لینے کا مطلب ایک درہم قرض لینا ہے اب اگر ادائیگی سے قبل سکے کی درہم کے ساتھ نسبت تبدیل ہو جائے مثلاً ایک درہم میں گیارہ سکے قرار دے دیئے جائیں جس کو اصطلاح میں سکہ کی قیمت میں کمی سے تعبیر

کیا جاتا ہے تو اس صورت میں گیارہ سکے دینے کا معنی ہوگا کہ پورا درہم واپس کیا گیا ہے جبکہ دس سکے واپس کرنے کا مطلب ہوگا کہ درہم کا دسواں حصہ کم کر دیا گیا ہے لہذا گیارہ سکے واپس کیے جائیں گے۔اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک کرنسی کی قوت خرید میں کمی کا ازالہ مقروض کی ذمہ داری ہے۔لیکن اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے مذکورہ موقف سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مالی واجبات کی ادائیگی میں کرنسی کی گرانی وارزانی کو پیش نظر رکھنے کے قائل ہیں۔

1. ایک تو اس لئے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے تو صرف ایک واقعاتی صورت کا حل بتایا ہے کہ اگر اس قسم کا معاملہ پیش آ جائے تو یوں تصفیہ کر لیا جائے،ان کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ بائع یا قرض دہندہ معاہدے کے وقت پیشگی یہ شرط لگا لے جبکہ اشاریہ بندی کے حامی تو کہتے ہیں کہ اسے بطور نظام نافذ کر دیا جائے۔ظاہر ہے یہ ان حضرات کی اپنی رائے تو ہو سکتی ہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی مراد یہ ہرگز نہیں ہے۔
2. دوسرا اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ سکے درہم کی ریزگاری ہیں اور سکے قرض لینے کا مطلب درحقیقت درہم قرض لینا ہے،لہذا درہم کے ساتھ ان کی نسبت تبدیل ہونے پر اتنے سکے ادا کئے جائیں گے جو درہم کی مالیت کے برابر ہوں۔لیکن مروجہ کرنسی دھاتی سکوں سے بالکل مختلف ہے یہ کسی کرنسی کی ریزگاری نہیں بلکہ سونے چاندی کی مانند خود مستقل کرنسی ہے اس لئے کرنسی نوٹوں کو ان پر قیاس کرنا درست نہیں۔

فائدہ:دھاتی سکے دراہم کی ریزگاری ہیں اور ان کی قیمت کم ہونے کا معنی درہم کے ساتھ ان کی نسبت بدل جانا ہے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ احمد بن الھائم (متوفی 815ھ) نے اپنے رسالہ ''نزھۃ النفوس فی بیان حکم التعامل بالفلوس'' کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ پہلے قدس شریف میں ایک درہم میں اَسّی سکے ہوتے تھے لیکن بعد میں چھیانوے کر دیئے گئے یوں سکوں کی قیمت کم ہوگئی پھر اس میں مزید تبدیلیاں آتی رہیں چنانچہ لوگ اپنے معاملات کے حوالے سے

شدید پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔''

اس کی ایک مثال ہمارے ہاں بھی ملتی ہے۔وہ یہ کہ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک ایک روپے میں چونسٹھ پیسے شمار ہوتے تھے مگر جب اعشاری نظام آیا تو حکومت نے اعلان کر دیا کہ اب ایک روپے میں سو پیسے ہوں گے،یعنی پہلے ایک پیسہ روپے کا چونسٹھواں حصہ تھا اور اب سواں حصہ بن گیا۔گویا اس کی قیمت میں کمی واقع ہوگئی،اب فرض کریں کہ ایک شخص نے اس تبدیلی سے قبل چونسٹھ پیسے قرض لئے تھے تو کیا وہ تبدیلی کے بعد چونسٹھ پیسے ہی واپس کرے گا یا کہ سو پیسہ؟امام ابو یوسف رحمہ اللہ کہتے ہیں چونکہ اس نے ایک روپے کی ریزگاری قرض لی تھی جواب سو پیسہ بن چکی ہے لہٰذا وہ سو پیسہ واپس کرے گا۔اس سے ان حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ قرض کی ادائیگی کے وقت کرنسی کی قوت خرید میں کمی کا ازالہ مقروض کی ذمہ داری ہے حالانکہ ان کا یہ منشاء نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ جس طرح سکوں کی قیمت میں کمی کا اعتبار کرتے ہیں اس طرح اضافے کا بھی اعتبار کرتے ہیں مگر اشاریہ بندی صرف اسی وقت عمل میں لائی جاتی ہے جب اشیاء کی قیمتیں بڑھ رہی ہوں،قیمتوں میں کمی کی صورت میں آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں کیونکہ اس صورت میں کوئی شخص اپنی قرض دی گئی رقم سے کم قبول کرنے پر راضی نہیں ہوگا۔اگر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو ہی دلیل بنانا ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ اس پر دونوں صورتوں میں عمل کیا جائے۔

خلاصہ کلام

مذکورہ بالا بحث کا ماحصل یہ ہے۔

- زر کی حیثیت صرف آلہ مبادلہ کی ہے، لہٰذا اس کی تجارت جائز نہیں۔
- عہد رسالت میں سونے، چاندی کے سکے دینار اور درہم رائج تھے مگر زر کے انتخاب میں سونے، چاندی کے سکے شرط نہیں ہے۔ اگر معاشرہ میں چمڑا بھی آلہ مبادلہ کی حیثیت سے رائج ہو جائے تو اس پر بھی زر کے احکام لاگو ہوں گے۔
- اجراء زر صرف حکومت کا حق ہے۔ ضربی عمل سے زر کی تخلیق اور پھیلاؤ کا بینکاری طریقہ غیر شرعی ہے اور معاشی اعتبار سے سخت نقصان دہ ہے۔
- کرنسی کی قدر معقول حد تک مستحکم ہونی چاہئے۔ جدید ماہرین معیشت کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت اشیاء وخدمات کی موجودہ یا متوقع پیداوار کی مالیت سے زائد کرنسی جاری نہ کرے۔
- کاغذی کرنسی سونے، چاندی کی طرح مستقل زر ہے۔
- جب کسی کے پاس ساڑھے باون تولے چاندی کی مالیت کے برابر نوٹ ہوں تو ان پر زکوۃ واجب ہوگی۔
- مختلف ممالک کی کرنسیوں کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ درست ہے بشرطیکہ کسی جانب سے ادائیگی ادھار نہ ہو لیکن ایک ملک کے یکساں مالیت کے کرنسی نوٹوں کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ناجائز ہے۔
- قرضوں کی اشاریہ بندی خلاف شریعت اور غیر منصفانہ ہے۔
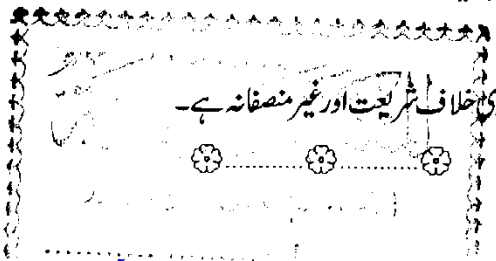
ابو ہریرہ شریعہ کالج

احباب دانش جانتے ہیں کہ اب تک ملک بھر میں ابو ہریرہ شریعہ کالج واحد ادارہ ہے جس میں لازمی (Compulsary) نصاب کے طور پر بیک وقت درس نظامی اور گریجویشن کروائی جاتی ہے۔ لہٰذا اپنے بچوں کو ابو ہریرہ کالج میں داخل کروائیں تاکہ وہ دینی و دنیوی علوم سے آراستہ ہو سکیں۔ بفضل اللہ تعالیٰ یہ ادارہ صرف مقامی احباب کی مدد سے چل رہا ہے۔

داخلہ میٹرک کے رزلٹ سے پہلے اور امتحان کے فوراً بعد

میٹرک کا امتحان دینے والے طلباء داخلہ لے سکتے ہیں۔ تاہم فیل ہونے کی صورت میں طالب علم کو فارغ کر دیا جائے گا۔

نصاب

سال اول: ترجمۃ القرآن سورۃ الفاتحہ تا الاعراف، مشکوٰۃ اول، علم النحو، کتاب النحو، علم الصرف، ابواب الصرف، دروس اللغۃ العربیۃ (دو حصے)، فرسٹ ائیر بمطابق انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور۔

سال دوم: ترجمۃ القرآن سورۃ الاعراف تا النمل، مشکوٰۃ ثانی، نحو میر، شرح مائۃ عامل، کتاب الصرف، اطیب المنح، معلم الانشاء (دو حصے) سیکنڈ ائیر بمطابق انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور۔

سال سوم: ترجمۃ القرآن، مسلم شریف، ترمذی شریف، ہدایۃ النحو، علم الصیغہ، السراجی، شرح نخبۃ الفکر، تھرڈ ائیر۔

سال چہارم: بخاری شریف، ہدایہ، الوجیز، شرح ابن عقیل، الفوز الکبیر، فورتھ ائیر نصاب، بمطابق پنجاب یونیورسٹی۔

ابو ہریرہ اکیڈمی کی نشریات، از قلم: میاں محمد جمیل

فہم القرآن: ابن کثیر، رازی، دیگر عربی تفاسیر کا خلاصہ اور تفسیر ثنائی، معارف، تدبر، تفہیم القرآن کے اہم نکات پر مشتمل، جدید و قدیم علوم کا سنگم جس میں رواں ترجمہ اور تفسیر بالحدیث کا التزام۔

امتیاز تفسیر: لفظی ترجمہ، آیت کے مسائل کی الگ الگ نشاندہی، ہر آیت کے مرکزی مضمون کی تفسیر بالقرآن کے ذریعے ایک مکمل تقریر۔ پہلے پندرہ پارے تین جلدوں میں دستیاب ہے۔ تفسیر کا آغاز 2005ء میں کیا گیا اور ہر سال پانچ پاروں پر مشتمل جلد پیش کی جا رہی ہے۔ ان شاء اللہ 2011ء میں مکمل ہو جائے گی۔

فہم الحدیث: مشکوٰۃ المصابیح سے متفق علیہ اور بخاری و مسلم کی مکمل روایات۔ اس کے مطالعہ سے تعلیم یافتہ طبقہ کو 80 فیصد مسائل کسی عالم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دیگر تصانیف: سیرت ابراہیم علیہ السلام ☆ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ دعا ☆ دین تو آسان ہے ☆ زکوٰۃ کے مسائل و فوائد ☆ آپ ﷺ کا تہذیب و تمدن ☆ مشکلات کیوں؟ نکلنے کے الہامی راستے ☆ آپ ﷺ کا حج (مختصر مگر جامع، ہر رکن کا فلسفہ) ☆ فضیلت قربانی اور اس کے مسائل ☆ آپ ﷺ کی نماز (قیام و سجود کی عملی تصویر) ☆ برکات رمضان ☆ اتحاد امت و نظم جماعت ☆ جادو کی تباہ کاریاں...... ان کا شرعی علاج۔

ملنے کا پتہ: نعمانی کتب خانہ ☆ مکتبہ سلفیہ ☆ مکتبہ قدوسیہ ☆ مکتبہ دار السلام اردو بازار لاہور

میاں محمد جمیل، پرنسپل ابو ہریرہ شریعہ کالج، 37۔ کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور۔ 042-5417233